جلد 6 شمارہ 8 اکتوبر 2004ء شعبان 1425ھ

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ○ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ○ (الاعلیٰ 14-15)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح وفلاح کا علمبردار

Registerd

CPL No. 4

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

اغراض و مقاصد

- کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے مطابق خالص توحید، اتباع رسول ﷺ، کثرت ذکر، مکارم اخلاق اور خدمت خلق پر مشتمل حقیقی اسلامی تصوف کی تعلیم کو فروغ دینا۔
- کشف و کرامات کی بجائے اللہ تعالیٰ کے قرب و عرفان اور اسکی رضا ولقاء کے حصول کو مقصود حیات بنانے کا ذوق بیدار کرنا۔
- حضور ﷺ کے صحابہ کی پیروی میں تمام فرائض منصبی اور حقوق العباد ادا کرتے ہوئے روحانی کمالات حاصل کرنے کے طریقہ کی ترویج۔
- آج کے دور کے مشغول زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت ہی مختصر اور سہل العمل اوراد و اذکار کی تلقین۔
- غصہ و نفرت، حسد و بغض، تجسس و غیبت اور ہوا و ہوس جیسی برائیوں کو ترک کر کے قطع ماسواء اللہ، تسلیم و رضا، عالمگیر محبت اور صداقت اختیار کرنے کو ریاضت اور مجاہدے کی بنیاد بنانا۔
- فرقہ واریت، مسلکی اختلافات اور لاحاصل بحثوں سے نجات دلانا، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی اہمیت کا احساس پیدا کر کے اپنی ذات، اہل و عیال اور احباب کی اصلاح کی فکر بیدار کرنا۔
- اللہ تعالیٰ کی رضا، اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی نیت سے دعوت الی اللہ اور اصلاح و خدمت کے کام کو آگے بڑھانا۔ اپنے مسلمان بھائیوں کے دلوں میں قلبی فیض کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی محبت بیدار کرنا اور روحانی توجہ سے انکے اخلاق کی اصلاح کرنا۔

عالمگیر محبت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا علمبردار

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

ماہنامہ

آدمیت

فلاح

گوجرانوالہ

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیادگار خواجہ عبدالحکیم انصاری رح

بانی سلسلہ

نگران و سرپرست

محمد صدیق ڈار صاحب توحیدی

شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ
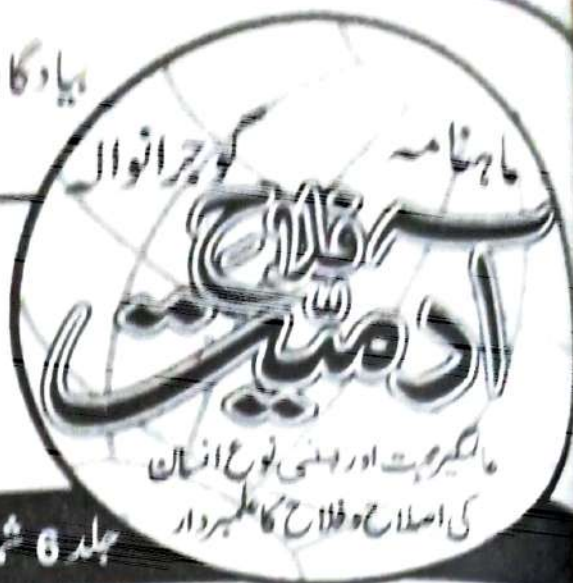
جلد 6 شمارہ 8 اکتوبر 2004ء شعبان 1425ھ

ایڈیٹر وحید احمد

قیمت ——— 20/- روپے

سالانہ فنڈ ——— 200/- روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:

محمد صدیق ڈار توحیدی

مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ

Ph:0431-862835

Mob: 0320-5793520

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:

وحید احمد

تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

Ph:0431-881379

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-431-222020

E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

مضمون	مصنف	صفحہ نمبر
اداریہ	وحید احمد	1
امت کی موجودہ زبوں حالی کے دو اسباب	محمد الیاس اظہر الازہری	3
بچپن کی کرامات	محمد صدیق ڈار توحیدی	6
خولجہ کے خطوط	خالد مسعود توحیدی	8
اقبال کا تصور خودی	سید رحمت اللہ شاہ	10
اسلامی نظام عدل نفاذ میں مشکلات اور حل	مولانا سید متین ہاشمی	14
فلاح یا نجات	صدر الدین	20
مغرب نے عورت کو کیا دیا	سید جلال الدین عمری	25
شرعی سزاؤں کی اہمیت	حضرت مولانا محمد اشرف	29
ایمی سے آمنہ تک	راشدہ قریشی	37
اختلافی مسائل اور ان کا نقطہ عدل	صدر الدین اصلاحی	42
ایک گورنر وہ بھی تھے	شاہ بلیغ الدین	47
مہدی اول	مولا شاہ محمد جعفر پھلواری	50
صنعتی ارتقاء اسلام کی روشنی میں	ظفر اقبال اعوان	56

اداریہ

اسلام اس کائنات وحیات انسانی کو خالق کائنات اللہ کے فراہم کردہ نظریہ حیات کے تابع کرتا ہے جہاں انسان کی حیثیت محض اللہ کی مخلوق کی ہے جو اس عالم طبعی میں اللہ کے احکامات کے مطابق زندگی بسر کرنے کیلئے بھیجا گیا ہے چنانچہ اس کائنات میں اقتدار اعلیٰ مکمل اور بلا شرکت غیرے ذات باری تعالیٰ کو حاصل ہے وہی نظام عالم کا خالق، مالک، حاکم، رازق اور قادر ہے ہر طرح کی قانون سازی اور اصول سازی اسی کیلئے مخصوص ہے۔ انسان زمین پر اللہ کے خلیفہ کی حیثیت سے اسی کے فراہم کردہ احکامات وقوانین کا نفاذ کرتا ہے۔ چنانچہ نظام خلافت میں قانون کا تصور یہ ہوتا ہے کہ "وہ اصول جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور اپنی وحی کے ذریعہ بندوں تک پہنچائے تاکہ انسان اس دنیا میں ان پر عمل کریں قانون کہلاتے ہیں" اس طرح ہر قسم کے رسم ورواج قانون کے دائرہ سے خارج ہو جاتے ہیں اسی طرح انسانی فرمانروائی کے تصور کے تحت حاکم [illegible] قوت سے عوام پر حکومت کرتا ہے لیکن اسلامی تصور کے تحت اللہ تعالیٰ قانون کی قوت کا محتاج نہیں۔ بلکہ قوانین اسکے محتاج ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اسلامی حکومت قانون ساز ہونے کی بجائے خود انہی قوانین کی ماتحت ہو کر عملدرآمد کرتی ہے جہاں اصل قوت قانون کو حاصل ہوتی ہے جس کے بغیر حکومت بے کار ہوتی ہے اور قانون کا وجود اسے نافذ کرنیوالی حکومت پر مقدم ہے۔ اسلامی قانون چونکہ فطرت انسان کے مطابق ہوتا ہے اس لئے افراد کو حکومت کی قوت کے خوف سے اعمال پر مجبور کرنے کے بجائے اطاعت کا ایک قوی عنصر خود انسان کے اندر پایا جاتا ہے کیونکہ اسلامی قانون خارج سے داخل ہونے کے بجائے اسے عہد ازل یاد دلاتا ہے کہ وہ فطرتا عبد ہے۔ عبدیت کا یہ ادراک وتصور انسان کو اطاعت واتباع کی راہ پر گامزن کر دیتا ہے اسی لئے قرآن مجید کہتا ہے:

"بیشک (قرآن مجید) یاددہانی ہے جس کا جی چاہے اپنے رب کا راستہ اختیار کرے دوسری جگہ اعلان کرتا ہے "بیشک ہم ہی نے یاددہانی (قرآن مجید) اتاری ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں اور قرآنی تصور حیات کی رو سے یاددہانی اس ازلی عبدیت کی ہے جو انسان کی فطرت میں مرکوز ہے اور مادی رجحانات کے باعث اکثر انسان سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ قرآن عبدیت کے

بعد معبود کی ربوبیت کا تصور پیش کرتا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کے ارتقاء وعروج میں رب کا دخل لازمی ہے جس سے وضع قانون کا انسانی تصور باطل ہوجاتا ہے اسی لئے اسلام ترقی وعروج اور قانون کی افادیت کا کوئی محدود تصور پیش کرنے کے بجائے اس کا سلسلہ ابتدائے زندگی اور انتہائے حیات سے منسلک کردیتا ہے۔ اسلامی قانون کی طرف سے وجود میں لائے گئے نفسی محرکات کے باعث قانون کے نفاذ کیلئے کسی قسم کے جبر کی حاجت نہیں رہتی اور اس قانون کا انسان کی ظاہری ومخفی زندگی پر یکساں اثر ہوتا ہے اس لئے ہمیں معلوم ہے ارشاد ربانی ہے:

"اے ہمارے رب بہ تحقیق تو جانتا ہے جو ہم چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ پر زمین وآسمانوں کی کوئی چیز مخفی نہیں رہتی" اسلامی قانون کے یہی نفسی اثرات ہیں جن کی محتاج حکومت ہوتی ہے اور قانون کو حکومت کی احتیاج نہیں رہتی اور یہی اسلامی وغیر اسلامی تصور قانون کا بنیادی اختلاف ہے کہ انسانی قانون سازی کے تحت قانون حکومت کا محتاج محض ہوتا اور اسلامی تصور میں قانون کو حکومت پر برتری وفوقیت حاصل ہوتی ہے بلکہ قانون کی گرفت کا یہ حال ہوتا ہے کہ اسلامی قانون سربراہ حکومت اور عام شہری کو اطاعت کے سلسلہ میں مساوی حیثیت دیتا ہے

والسلام

وحید احمد

امت کی موجودہ زبوں حالی کے دو اسباب

محمد الیاس اظہر الازہری

امام ابوداؤدؒ نے حضرت ثوبانؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

ترجمہ: ''میری امت پر وہ وقت آنے والا ہے جب دوسری امتیں (یہود، ہنود و نصاریٰ وغیرہ) اس پر اس طرح ٹوٹ پڑیں گی کہ جس طرح (بھوکے) کھانے والے لوگ دستر خوان پر ٹوٹ پڑتے ہیں''۔ کسی کہنے والے نے کہا کہ: ''جس زمانے کا آپؐ حال بیان فرمارہے ہیں اس زمانے میں کیا ہم مسلمان اتنی کم تعداد میں ہونگے کہ (ہم کو نگل لینے کے لئے غیر قومیں متحد ہوکر ہم پر ٹوٹ پڑیں گی؟'') آپؐ نے فرمایا: ''نہیں! اس زمانے میں تمہاری تعداد کم نہ ہوگی بلکہ تم بہت بڑی تعداد میں ہوگے، لیکن تم سیلاب کے جھاگ کی طرح (اندر سے خالی) ہوجاؤ گے، اور تمہارے دشمنوں کے سینوں سے تمہاری ہیبت اور رعب نکل جائے گا اور تمہارے دلوں میں بزدلی اور پست ہمتی گھر کر جائینگے۔ اس بزدلی کا نام ''الوھن'' ہوگا۔

ایک سوال کرنے والے نے پوچھا! ''اے رسول اللہ ﷺ یہ ''وہن'' کس وجہ سے آجائے گی؟''۔ آپؐ نے فرمایا! ''کہ اس کی دو وجوہ ہونگی۔ (۱) تم (آخرت کی محبت کی بجائے) دنیا سے محبت کرنے لگو گے اور (۲) خدا کی راہ میں جان قربان کرنے کی بجائے موت سے ڈرنے اور نفرت کرنے لگو گے''۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے:

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین

یعنی ''اے ایمان والو! نہ تو تم کمزوری اور بزدلی دکھاؤ اور نہ ہی خوف و ہراس میں مبتلا ہو۔ کیونکہ اگر تم (صحیح معنوں میں) مومن ہوئے تو آخر کار تم ہی غالب آکر رہوگے''۔

حدیث مذکورہ بالا اور آیت شریف کی روشنی میں ہم اپنا جائزہ لیں تو موجودہ صورت حال کی ذمہ داری خود ہم پر عاید ہوتی ہے۔ موجودہ نقشے پر نظر ڈالیں تو تمام آبی گزرگاہیں اور تجارتی راستے (آبنائے باسفورس، نہر سویز، خلیج عقبہ، بحیرہ احمر، باب المندب، قرن الذہب، خلیج فارس، خلیج

بنگال، آبنائے ملاکا، شاہراہ ابریشم، ایفرو ایشین شاہراہ اعظم) مسلمانوں کے پاس ہیں۔ افرادی قوت ایک ارب تیس کروڑ سے زیادہ ہے۔ پوری دنیا کی اقتصادی شاہ رگ (تیل، گیس، یورینیم، کوئلہ، نمک، سونا وغیرہ) کی شکل میں مسلمانوں کے پاس ہے۔ اگر پوری اسلامی دنیا کی افواج اکٹھی کر لی جائیں تو ہوائی، بری اور بحری افواج کی قوت طیاروں، بحری جہازوں اور آبدوزوں کی تعداد کفار کے مقابلے میں کسی طرح کم نہیں۔ خام مال کے علاوہ تیار مال میں بھی مسلم ممالک کسی سے پیچھے نہیں، اگر ٹینکوں، توپوں، میزائلوں اور دیگر اسلحہ کا اندازہ لگایا جائے تو بے شمار اسلحہ بعض مسلم ممالک برآمد بھی کرتے ہیں۔

اب اللہ کے فضل و کرم سے مسلمان ایٹمی طاقت بھی بن چکے ہیں۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سب کچھ کے باوجود مسلمان سیلاب کی جھاگ کی مانند (یا بقول شاعر: مسلمان نہیں راکھ کا ڈھیر ہے) کیوں ہیں؟ جسے وقت کی آندھی کبھی ادھر اور کبھی ادھر اڑا کر بکھیر رہی ہے۔ آج امت مسلمہ ہر جگہ پٹ رہی ہے عصمتیں مسلمانوں کی لٹ رہی ہیں۔ آبادیاں ان کی کھنڈر بنائی جارہی ہیں، باغات اور کھیت ان کے اجاڑے جارہے ہیں، بچے ان کے ذبح ہو رہے ہیں۔ ہر روز سینکڑوں مسلمانوں کے خون ناحق سے زمین کو سیراب کیا جارہا ہے۔ ساری دنیا کے کافر مل کر امت مسلمہ کو مٹانے کے لئے زور لگا رہے ہیں۔ ان کے وسائل پر قبضہ جما کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر چند مٹھی بھر جاں نثار اپنی قربانیاں اور جانوں کے نذرانے دے کر ان کے راستے میں رکاوٹ نہ بن گئے ہوتے تو شاید آج برائے نام آزاد مسلم ملک کوئی بھی باقی نہ ہوتا۔

ہر روز اخبارات دس پندرہ کشمیریوں، بیس پچیس افغانوں، پندرہ بیس عراقیوں، تیس چالیس فلسطینیوں، اور سات آٹھ چیچن مسلمانوں کی شہادتوں سے بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ یہ یک طرفہ ٹریفک آخر کب تک چلے گی؟

اگر ہم غور کریں تو جواب سامنے ہے۔ کیونکہ نبی صادق و مصدوق علیہ السلام کا فرمان اٹل ہے۔ دنیا بدل سکتی ہے آپ کا فرمان جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ آپ کی صداقت پر تو دشمن نے بھی گواہی دی ہے۔ لہٰذا مرض کا اصل سبب اور اس کا صحیح علاج تلاش کرنا پڑے گا۔ جسکی نشاندہی حدیث مذکورہ بالا میں کر دی گئی ہے۔ یعنی مرض ہے "وہن" اور اس کا سبب ہے **"حب الدنیا**

وکراھیت الموت"۔

یہ امر مشاہدے میں آیا ہے کہ عیش وعشرت کی زندگی گزارنے والا شخص موت سے گھبراتا ہے جبکہ ایک جھونپڑی نشین قلاش آدمی موت کے لئے دعائیں کرتا ہے۔ صاف ظاہر ہے عاد وثمود کی طرح بلند وبالا بنگلے، کوٹھیاں اور محلات بنا کر زندگی کی تمام آسائشوں سے متمتع شخص کب دنیا سے نفرت اور آخرت کی خواہش کرے گا؟ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

کن فی الدنیا کانک غریب اوکعابر سبیل

"یعنی دنیا میں اس طرح رہو جس طرح کوئی مسافر یا راہگیر رہتا ہے"۔

جس کا ایک قدم رکاب میں اور ایک زمین پر ہو۔ کیا عالم اسلام کے موجودہ خوشحال اور مرفع الحال معاشرے اپنی جنت ارضی کو چھوڑنے پر آمادہ ہیں؟

ان پر یہ مشہور مصرع صادق آتا ہے:

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اس لئے جب تک ہم بحیثیت مجموعی توبہ کر کے اصل بیماری سے نہیں بچیں گے۔ نتیجہ بھی وہی نکلے گا جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

مسلمان معاشروں میں عریانی، بے حیائی، ملاوٹ، اقربا پروری، سودخوری، زناکاری، شراب نوشی، بے ایمانی، ٹھگی، دھوکہ دہی، فریب کاری، ثقافت کی نام پر بے پردگی، شادی بیاہ کے مواقع پر ہندوانہ رسومات کی پیروی کیا یہ سب کچھ "حب الدنیا" کے ذیل میں نہیں آتا؟ اگر موت آنکھوں کے سامنے ہو (حالانکہ اس سے کافر کو بھی انکار نہیں) اور خدا کے سامنے پیش ہونے پر یقین کامل ہو تو پھر خدا اور رسول ﷺ کے فرامین کی یوں خلاف ورزی اور اس کے جواب میں عذاب الٰہی کی یوں بہتات نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق دے۔ آمین

بچپن کی کرامات

محمد صدیق ڈار توحیدی

ایک مجلس میں بانی سلسلہ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے ارشاد فرمایا:

''ہمارے سلسلے میں کرامات کا چرچا نہیں کیا گیا۔ میں اسے اچھا نہیں سمجھتا اس لئے میں نے بھائیوں کو منع کر رکھا ہے کہ میری کرامات بیان نہ کیا کریں۔ کیونکہ اصل چیز تعلیم ہے اس لئے تعلیم کو دیکھنا چاہیے کہ آیا یہ قرآن وسنت کے مطابق اور قوم کو موجودہ پستی کی حالت سے نکالنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ لیکن ہمارے عوام گذشتہ کئی صدیوں سے مروج تصوف کی تعلیم کے زیر اثر کرامات کے اس قدر رسیا ہو چکے ہیں کہ جہاں کہیں کسی اللہ والے بزرگ کا تذکرہ ہو تو سب سے پہلے یہ پوچھتے ہیں کہ ان کی کرامات بتائیے۔ میری کرامات اگر لکھی جائیں تو ایک کتاب مرتب ہو جائے۔ سلسلے کے ہر بھائی کے پاس کسی نہ کسی کرامت کی داستان موجود ہوگی۔ کرامات کا یہ ہے وہ تو میرے بچپن ہی سے سرزد ہونے لگ گئی تھیں۔ میری اماں نے مجھے بتایا کہ ابھی میں بہت چھوٹا تھا کہ برستی بارش میں صحن میں چلا گیا وہ مجھے منع کرتی رہیں کہ لباس بھیگ جائے گا۔ لیکن میں نہ مانا اور صحن کے چند چکر لگا کر واپس آیا۔ تو وہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ میرا لباس بالکل خشک تھا۔ اسی طرح ایک اور واقعہ ہے کہ میں چند برس ہی کا تھا کہ میرے ابا جی نے ملازمت کے لئے چند جگہ درخواستیں دے رکھی تھیں۔ میری اماں جان بستر پر اس طرح لیٹی ہوئی تھیں کہ گھٹنے کھڑے تھے۔ میں ان کے پاس کھیل رہا تھا کہ ان کے گھٹنوں کے نیچے سے گزرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اماں جی نے ڈانٹا کہ یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میں نے کہا کہ اماں جی ہلنا نہیں اور میں نیچے سے گزر گیا اور کہا کہ آج ابو جان کو ملازمت مل گئی ہے۔ اور واقعی اسی دن آپ ملازمت پر تعینات ہو گئے۔ میری رشتے میں ایک دادی تھیں انہیں کئی دنوں سے بخار تھا۔ میں نے پوچھا دادی جان کیا حال ہے تو وہ کہنے لگیں تم کیسے ''حکیم'' ہو کہ کوئی دوا ہی نہیں بتاتے۔ میں نے اسے کہہ دیا کہ دادی آپ ایک پیالی سرسوں کا تیل پی لیں۔ اس اللہ کی بندی نے ایسا ہی کیا تو اسے ٹٹیاں لگ گئیں اور بخار ٹوٹ گیا۔ لڑکپن میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ باہر کھیلتے تو میرے دوست کہتے کہ انصاری ہوا چلا دو۔ میں آنکھیں بند کر کے ہاتھ پھیلاتا اور انہیں ہلاتے ہوئے کہا ''چلو چلو'' تو ہوا چلنے لگتی۔ کبھی

کہتے کہ شہر کی بجلی بند کر دو تو میں آنکھیں بند کر کے اشارہ کرتا تو بجلی بند ہو جاتی۔ کوئی شخص گھوڑے پر سوار جا رہا ہوتا تو ساتھی فرمائش کرتے کہ اسے گھوڑے سے گرا دو۔ میں خیال کرتا تو گھوڑے کے پاؤں پھسلتے اور سوار گر جاتا۔ یہ سب بچپن مستی کے کرتب اور فضول باتیں ہیں۔ آپ بتائیے کہ اس وقت نہ تو میں نے کہیں بیعت کی تھی اور نہ ہی میں اللہ اللہ یا کوئی اور وظیفہ کرتا تھا تو اس میں میری کرامت کیا ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور حکمت تھی کہ اس نے جس طرح چاہا مجھے پیدا فرمایا۔ اب تو میں نے بھائیوں کو اجازت دے دی ہے کہ تعلیم کے ساتھ ساتھ کرامات بھی بیان کر دیا کرو۔ جب میں انڈیا میں تھا تو ایک دن اللہ کے ذکر میں مست سڑک پار کرتے ہوئے ٹرام سے ٹکر ہوگئی تو میں گر گیا لیکن ٹرام بھی الٹ گئی۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہوا اور میں اٹھ کر چل دیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ ایک مرتبہ کسی دور دراز دیہات کے سفر کے لئے میں تانگہ گاڑی میں سوار تھا۔ میرا یہ معمول تھا کہ سفر کے دوران سورت یاسین شریف کی تلاوت کرتا رہتا تھا۔ میں اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان لگائے تلاوت کر رہا تھا کہ ناہموار راستے کی وجہ سے گاڑی الٹ گئی اور اس نے دو تین قلابازیاں کھائیں۔ میں نے بے اختیار ہر قلابازی پر کہا ''بسم اللہ، بسم اللہ، بسم اللہ''۔ جب گاڑی رکی تو کئی لوگ زخمی تھے اور کچھ کی ہڈیاں بھی ٹوٹ گئی تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھ پر ایسا کرم فرمایا کہ کوئی خراش تک نہ آئی۔ وہاں سے ہم دوسری گاڑی پر آگے روانہ ہوئے۔ یہاں پاکستان ائیرفورس میں جب میں نے لائبریرین کے طور پر ملازمت کی اور چند دنوں کی رخصت پر چلا گیا تو میرے ساتھیوں میں سے جو کوئی بھی میری کرسی پر بیٹھتا اسے بجلی کا جھٹکا محسوس ہوتا۔ میں چھٹی سے واپس آیا تو دوستوں نے یہ بات مجھے بتائی۔ میں نے کہا تم بے وقوف ہوگئے ہو بھلا لکڑی کی کرسی کس طرح شاک دے سکتی ہے۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھے تو کچھ نہیں ہوا۔ لیکن انہیں ساتھیوں میں ایک پیسہ اخبار قسم کا آدمی تھا اس نے ہماری بزرگی کا جگہ جگہ چرچا کیا۔ اپنے گھر میں میری دعوت بھی کی اور اولاد کے لئے دعا بھی کرائی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی۔ اس ڈھنڈورچی کی وجہ ہی سے لوگ آنے لگے اور مجھے پیر بننا پڑا ورنہ میں منظر عام پر آنے کو سخت ناپسند کرتا تھا۔ وہ جب بھی یاد آتا ہے اسے خوب گالیاں دیتا ہوں۔ کس مردود کی یہ خواہش تھی کہ پیر بنوں۔ تنہائی کے بڑے مزے تھے۔ بس اللہ میاں جسے گدھا دیکھتے ہیں لاد دیتے ہیں۔

خواجۂ کے خطوط

ترتیب وتدوین:- خالد مسعود توحیدی

(پہلی قسط)

مریدین سے بے تکلفی اور پیار

بانی سلسلہ توحیدیہ" کے خطوط میں سے مختلف بھائیوں کو لکھے ہوئے کچھ پیار بھرے نثے قارئین کی خدمت میں پیش کئے جارہے ہیں۔ عنوان اس مرتبہ ایک ہی ہے۔ امید ہے آپ محظوظ ہونگے۔

1- ''کاش آپ روز یہاں آسکتے۔ نہیں آسکتے تو ہفتہ میں ایک مرتبہ خط ہی لکھ دیا کرو۔ اس سے تسکین ہوجاتی ہے''۔

(بنام محمد صدیق ڈار توحیدی 1967ء)

2- ''میں بخدا اپنے سب مریدوں سے بے انتہا محبت کرتا ہوں۔ لیکن اگر فرائض کی پابندی نہ ہو اور ڈسپلن کا خیال نہ رکھا جائے تو میں محبت کی پرواہ نہیں کرتا''۔

(بنام محمد مرتضٰی 1.3.1965)

3- (راولپنڈی آنے کے تقاضہ پر) ''بیٹی کی شکایت بجا ہے اور اسکولڑنے کا پوراحق ہے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ اس کو لڑنا بھی نہیں آتا۔ مجھے مکان ملنے کے بعد وہ جب چاہے بنوں آسکتی ہے۔ فی الحال تو میں خود غیروں کے ہاں مہمان ہوں''۔

(بنام محمد صدیق ڈار 23.9.1960)

4- ''اچھا ہوا آپ میری بیٹی کے لئے ریڈیو ٹرانزسٹر لے آئے۔ مگر اس کو یاد دلادیں کہ یہ بات کہ جو مانگو گی ملے گا اس شرط پر کی گئی تھی کہ اللہ اللہ میں ترقی کرو اور کبھی نہ چھوڑو۔ مگر میں تو اس کی طرف توجہ کرتا ہوں تو مجھے تو کنکشن بھی نہیں ملتا۔ اگر ایسی ہی اللہ اللہ کرو گی تو ہماری بات واپس اور کینسل''۔

(بنام محمد صدیق ڈار 2.1.1961)

5- ''آپ کا -/25 روپے کا منی آرڈر مل گیا۔ اس میں -/18 روپے چندے کے بعد -/7 روپے مٹھائی کے ہیں جو خط میں لکھا ہے۔ اتنے روپے کی مٹھائی Due ہے۔ گزیٹیڈ کی ترقی میں اس قدر سستے نہیں چھوٹ سکتے۔ مٹھائی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے یہ تو آپ کی سعادت مندی ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ کافی ترقی ہوئی ہوگی اس لئے لکھ دیا تھا''۔

(بنام محمد صدیق ڈار 14.2.1962)

6- میرے لئے باہر سے ایک فسٹ کلاس فاؤنٹن پین لائیں جس سے میں وہ دوسری کتاب جو لکھنا چاہتا ہوں لکھ سکوں۔ پین ایسا ہونا چاہیے کہ جو ایک مرتبہ بھرنے کے بعد گھنٹوں چل سکے۔ اس کے علاوہ جو مرضی ہو لے آنا۔ اس قلم سے جو کتاب لکھی جائے گی اس میں جتنے لفظ ہونگے ان کا ثواب آپ کو بھی پہنچے گا''۔

(بنام محمد صدیق ڈار 13.8.1962)

7- ''دعا کریں کہ صحت ایسی ہو جائے کہ کچھ دن آپ کے پاس رہ سکوں''۔

(بنام محمد صدیق ڈار 13.8.1962)

8- ''کاش میری صحت اجازت دیتی اور اس موقعہ پر جب حلقہ کے کئی اچھے اچھے لوگ سرگودھا میں جمع ہو گئے ہیں میں بھی وہاں آتا۔ مگر اللہ کو منظور نہیں''۔

(بنام محمد صدیق ڈار 1968)

9- ''میری طرف سے سب بھائیوں کو سلام محبت پیش کریں۔ خط لکھتے رہا کرو اس سے بیماری میں کمی آ جاتی ہے''۔

(بنام محمد صدیق ڈار 1968)

10- ''میں پنڈی میں دس دن رہا۔ آپ کے بھائیوں نے اس قدر تنگ کیا کہ کسی رات کو بھی ایک بجے سے پہلے نہ سو سکا۔ دن کو بیٹیوں نے سونے نہ دیا۔ گیا تھا آرام کی خاطر اور تکلیف ہوگئی۔ میری صحت کا کوئی خیال نہیں کرتا، سب اپنے مزے کو دیکھتے ہیں چلو میں اسی طرح خوش ہوں''۔

(بنام محمد صدیق ڈار 8.9.1968)

11- ''آپ جب چاہیں بنوں تشریف لے آئیں۔ میں بھی آپ کا ہوں یہ گھر بھی آپ کا ہے''۔

(بنام محمد صدیق ڈار 18.2.1964)

12- ''بیگم صاحبہ کا حکم مقدم ہے کیونکہ اگر آپ میرا حکم نہ مانیں تو میں تو معاف کر دونگا لیکن بیگم صاحبہ بھلا کیونکر معاف کرنے لگیں۔ خیر میں خوش ہوں کہ آپ نے بیگم صاحب کو خوش کیا''۔

(بنام محمد صدیق ڈار 13.1.1963)

اقبالؒ کا تصور خودی

مرسلہ سید رحمت اللہ

اس مطلب کی وضاحت کے لئے کہ افلاطون جس کے افکار سے تصوف اور مسلم اقوام کے ادب نے بہت اثر لیا ہے، وہ مسلک گوسفندی کا پیرو تھا۔ اس لئے اس کے تخیلات سے بچنا چاہیے

اقبال کہتے ہیں کہ حکیم افلاطون جو ایک قدیم زمانے کا راہب تھا، وہ اپنے عہد کے سفندوں کے گروہ میں سے تھا۔ اس کا گھوڑا معقولات کے اندھیرے میں راہ گم کئے ہے، جو غیر کے کوہستان میں عاجز ہو کر رک گیا ہے۔ وہ قیاسی علم کے افسوں سے اس درجہ مسحور ہوا کہ ہاتھ آنکھ اور کان (جو تجرباتی علم کے ذرائع ہیں) پر سے اس کا اعتبار جاتا رہا۔ (وہ) کہنے لگا زندگی کا راز مر جانے میں ہے، شمع کے بجھ جانے سے سینکڑوں جلوے پیدا ہوتے ہیں۔ افلاطون ہمارے افکار پر حکمراں ہے، حالانکہ اس کا جام خواب آور ہے اور نفی دنیا کی دعوت دیتا ہے۔ وہ انسان کے لباس میں ایک بھیڑ ہے، مگر وہ صوفی کے تخیل پر مسلط ہے۔ اس نے اپنی عقل کو بہت کچھ سمجھا اور عالم اسباب کو محض افسانہ بتایا۔ اس کا کام زندگی کے اجزاء کو ناپید کرنا ہے، وہ زندگی کی سرورخیز شاخیں کاٹتا ہے۔ افلاطون کے فکر نے انسان کے نقصان کو اس کا فائدہ قرار دیا، اس کے فلسفے نے موجود کو ناموجود ٹھہرایا۔ اس کی فطرت سوگئی اور اس نے خواب کی دنیا تخلیق کی، اس کی آنکھ نے (سوتے میں) سراب پیدا کیا۔ چونکہ وہ ذوق عمل سے محروم تھا، اس لئے اس کی جان عدم پر وارفتہ و شیدا تھی۔ اس نے ہستی کی کشمکش سے انکار کیا، اور وہ اعیان (Forms) پیدا کئے جن کا عالم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ جس شخص کے اندر جان ہے، اس کے لئے تو ممکنات کی دنیا بہتر ہے البتہ مردہ دل کے لئے خیالی دنیا اچھی ہے۔ افلاطون کا ہرن خرام کے لطف سے بے بہرہ ہے، اس کا چکور لذت رفتار سے محروم ہے۔ اس کی شبنم پرواز سے بے نصیب ہے، اس کے پرندے کے سینے میں نغمہ آرائی کا دم نہیں۔ اس کے دانے میں اگنے کا ذوق نہیں، اس کا پروانہ تڑپ سے ناآشنا ہے۔ اس راہب کے لئے فرار کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا، وہ اس دنیا کے ہنگامے کی طاقت نہ رکھتا تھا۔ اس لئے اس نے بجھے ہوئے انگارے کے سوز سے دل لگایا اور اپنی افیون خوردہ دنیا کا نقشہ تیار کیا۔ اس نے اپنے نشیمن سے آسمان کی طرف پرواز کی، لیکن پھر اپنے نشیمن کی طرف نہ لوٹا۔ اس کا خیال آسمان کے خم میں گم ہو چکا ہے، میں نہیں جانتا کہ اس کے پاس تلچھٹ ہے یا وہ خم کے منہ پر رکھی ہوئی اینٹ ہے۔ اس کی مستی سے قومیں زہر آلود ہو گئیں، سو گئیں اور ذوق عمل سے محروم ہو گئیں

شعر کی حقیقت اور اسلامی ادب کی اصلاح کی بیان میں

آرزو کے داغ سے انسان کے اندر جوش پیدا ہوتا ہے، اس خاک (انسان) کی آگ آرزو
روشن ہوتی ہے۔ تمنا، جام زندگی کی شراب ہے، اسی سے زندگی میں سرگرمی اور مستعدی پیدا
ہوتی ہے۔ زندگی کا مقصد کائنات کی قوتوں کی تسخیر ہے اور آرزو اس تسخیر کے لئے افسوں کا کام
کرتی ہے۔ زندگی شکار کھلتی ہے اور اس کا جال آرزو ہے، آرزو حسن کے لئے عشق کی طرف سے
پیغام ہے۔ ہر لمحہ تمنا کیسے ابھرتی ہے؟ یہ زندگی کے نغمہ کا زیر و بم ہے۔ جو چیز خوبصورت، زیبا اور
جمیل ہے وہی طلب کے بیاباں میں ہمارے لئے راہنما بنتی ہے۔ تیرے دل میں اس کا نقش
بیٹھ جاتا ہے، جم جاتا ہے اور وہ تیرے اندر آرزوئیں پیدا کرتی ہے۔ حسن بہار آرزو کا اخلاق ہے،
اس کے جلووں سے آرزو پرورش پاتی ہے۔ شاعر کا سینہ جلوہ گاہ حسن ہے، اس (طور) سینا سے
حسن کے انوار پھوٹتے ہیں۔ اس (شاعر) کی نگاہ سے خوبصورت اور خوبصورت ہو جاتا ہے، اس
کے اشعار کے افسوں سے فطرت کا حسن زیادہ خوبصورت لگتا ہے۔ شاعر کے نغمے سے بلبل نے نوا
سیکھی ہے، اس کے غازے نے پھول کو چمکا دیا ہے۔ پروانوں کے دل میں اسی کا سوز ہے وہی
عشق کے افسانوں کو رنگین بناتا ہے۔ شاعر کی آب و گل میں سمندر اور خشکی پوشیدہ ہے، اس کے
دل کے اندر سینکڑوں جہاں نہاں ہیں۔ اس کے دماغ میں ایسے گل ہائے لالہ موجود ہیں جو ابھی
کھلے نہیں، وہ ایسے نغموں اور نالوں سے بھرا ہوتا ہے جو ابھی تک کسی نے نہیں سنے۔ اس کی فکر کی
پرواز چاند اور ستاروں تک ہے، وہ بدصورتی سے ناآشنا ہے، صرف حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ خضر کی
طرح شاعر کے ظلمات میں آب حیات ہے، اس کے آنسو کائنات کو زندہ تر کر دیتے ہیں۔ ہم
سست رو، ناپختہ اور بے سمجھ ہیں، اور منزل کی راہ میں گرے پڑے ہیں۔ اس کا بلبل نوا پرداز ہے،
ہمیں سفر پر آمادہ کرتا ہے۔ تا کہ ہمیں زندگی کی بہشت تک پہنچا دے، اور ہماری زندگی کی قوس
دائرہ بن جائے (یعنی ہم مکمل ہو جائیں)۔ اس کی بانگ درا سے قافلے روانہ ہوتے ہیں اور
کاروان اس کی صدا پر سفر جاری رکھتے ہیں۔ وہ ہماری زندگی کے باغ میں نسیم بن کر آتا ہے اور لالہ و
گل میں آہستگی سے داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے جادو سے زندگی کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے،
زندگی اپنا محاسبہ خود کرتی ہے اور آگے بڑھنے کے لئے بے تاب ہوتی ہے۔ وہ دنیا والوں کو اپنے
خوان کی دعوت دیتا ہے اور اپنی آتش شوق کو ہوا کی طرح عام کر دیتا ہے۔ افسوس اس قوم پر جو
موت لانے میں خود حصہ دار بنتی ہے، جس کا شاعر ذوق حیات سے روگرداں ہے۔ جس کا

آئینہ (افکار) بری چیز کو اچھی کر کے دکھاتا ہے، جس کا شہد جگر میں سینکڑوں نشتر چبھوتا ہے۔
پھول کو بوسہ دے تو پژمردہ ہو جاتا ہے، جو بلبل کے دل سے ذوق پرواز چھین لیتا ہے۔ جس کی
افیون افراد قوم کے اعصاب شل کر دیتی ہے، جس کا مضمون قوم سے زندگی چھین لیتا ہے۔ جو سرو
سے ذوق رعنائی چھین لیتا ہے۔ جس کی آہ سرد جرات مند شاہین کو چکور بنا دیتی ہے۔ ایسا شاعر
دراصل مچھلی ہے، لیکن سینے سے سر تک آدم کی صورت رکھتا ہے، بنات آشیاں کی طرح وہ سمندر

ہی میں رہتا ہے۔

مفہوم: وہ اپنے نغمے سے ملاح کو سحر زدہ کر دیتا ہے اور اس کی کشتی کو دریا کی گہرائی میں غرق کر دیتا ہے۔ اس کے نغمے دلوں سے استقلال چھین لیتے ہیں، اس کے جادو سے لوگ موت کو زندگی سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ تیرے اندر سے زندگی کی خواہش نکال لیتا ہے، گویا تیرے کان کے اندر سے سرخ لعل نکال لیتا ہے۔ وہ نفع کو نقصان بنا کر دکھاتا ہے اور ہر اچھی چیز کو بری بنا دیتا ہے۔ وہ تجھے وسوسوں کے سمندر میں ڈال دیتا ہے اور اس طرح عمل سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ اس کے بولنے سے بیمار اور زیادہ بیمار ہو جاتا ہے۔ اس کا جام انجمن کو مزید ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ اس کے بادل میں برق کی ندی نہیں، اس کا باغ رنگ و بو کا سراب ہے۔ اس (کے کلام) کی خوبصورتی کو سچائی سے کچھ سروکار نہیں، اس کے سمندر میں عیب دار موتیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ نیند کو بیداری سے بہتر قرار دیتا ہے، اس کی پھونکوں سے آگ تیز ہونے کی بجائے بجھ جاتی ہے۔ اس کی بلبل کے نغموں سے دل زہر آلود ہو جاتا ہے۔ اس کے پھولوں کے انبار کے نیچے سانپ سویا ہوا ہے۔ اس کے خم، مینا اور جام سے خدا کی پناہ، اس کی آئینے کی مانند شفاف شراب سے خدا محفوظ رکھے۔ تو ایسے ہی شاعر کی شراب پی کر گرا پڑا ہے تیری صبح اس کی مینا کی رہین منت ہے۔ اس کے نغمے سے تیرے دل کا جوش ٹھنڈا ہو چکا ہے، تو نے اس کے نغموں کی صورت میں کان کی راہ سے زہر کھایا ہے۔ تیرا انداز ہی انحطاط کی دلیل ہے، تیرے ساز کا تار نوا پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ تو آرام طلبی کے باعث اس قدر کمزور ہو چکا ہے، کہ دنیا میں مسلمانی کے لئے باعث شرم ہے۔ تجھے پھول کی رگ سے باندھا جا سکتا ہے (اور) باد نسیم کا جھونکا تجھے زخمی کر سکتا ہے۔ تیری آہ و پکار نے عشق کو رسوا کر دیا ہے، تیری مصوری نے عشق کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بد صورت ہے۔ تیری بیماری کی وجہ سے عشق کے رخسار بھی زرد ہو چکے ہیں، تیری بے حسی نے عشق کی آگ کی تپش ختم کر دی ہے۔ تیرے زخموں کی وجہ سے تیرا عشق بھی مضمحل ہے، تیری کمزوری کی وجہ سے تیرا عشق (تاب و) تواں سے محروم ہے۔ اس کے عشق کے پیمانہ میں سوائے بچوں کی طرح رونے کے اور کچھ

نہیں، اس کے گھر کی ساری متاع صرف سرد آہیں بھرنا ہے۔ اس کا عشق میکدوں کی بھیک سے
سرمست ہے، اس کا کام دوسروں کے گھروں کے روشندانوں سے روشنی چرانا ہے۔ یہ عشق ہمیشہ
ناخوش، افسردہ اور آزردہ رہتا ہے اور (خانہ محبوب کے) پاسبان کی مار پیٹ سے ادھ موا رہتا
ہے۔ غموں کے ہجوم کی وجہ سے وہ سرکنڈے کی مانند نحیف و نزار ہے، اس کی زبان پر ہمیشہ آسمان
کے سینکڑوں شکوے رہتے ہیں۔ اس کے آئینہ فطرت کا جوہر خوشامد یا کینہ ہے اور کمزوری سے اس
کی قدیم رفاقت ہے۔

مفہوم: اقبال فرماتے ہیں کہ یہ عشق کم نصیبی، کم زوری، پس فطرتی، نالائقی، ناامیدی اور
ناکامی کا شکار رہتا ہے۔ اس کی آہ و پکار نے تمہاری زندگی کی پونجی اور ہمسایوں کی آنکھوں سے نیند
کا لطف چھین لیا ہے۔ افسوس ایسے عشق پر جس کی آگ بجھ چکی ہو، جو حرم میں پیدا ہوا اور بت
خانہ میں جا کر مر گیا۔ اے وہ شخص جس کی جیب میں سخن (شاعری) کی نقدی ہے، اپنی شاعری کو
زندگی کی کسوٹی پر رکھ۔ پر امید سوچ عمل کی رہنما بنتی ہے، اس کی مثال یوں ہے جیسے کڑک سے
پہلے بجلی کی چمک۔ ادب میں فکر صالح ہونی چاہیے (اور) چاہیے کہ ہم دوبارہ عربی ادب کی طرف
رجوع کریں۔ دل عرب کی محبوبہ کے سپرد کرنا چاہیے، تاکہ کرد کی شام سے حجاز کی صبح پھوٹے۔
تو نے عجم کے باغ سے پھول چنے ہیں، ہند اور ایران کی نو بہار بھی دیکھی ہے۔ اب کچھ دیر کے
لئے صحرا کی گرمی میں کھجور سے کشید کی ہوئی شراب بھی چکھ۔ ذرا صحرا کے گرم پہلو میں بھی سر ڈال،
تھوڑی دیر کے لئے اپنے بدن کو اس کی باد صرصر کے حوالے کر۔ تو بڑی مدت تک ریشمی لباس میں
غرق رہا ہے، اب تھوڑی دیر کے لئے کھردرا کپڑا پہننے کی عادت بھی ڈال۔ تو صدیوں تک گل لالہ
کی پتیوں پر رقص کرتا رہا ہے (اور) تو پھول کی مانند اپنے رخساروں کو شبنم سے دھوتا رہا ہے۔ اب
اپنے آپ کو تپتی ہوئی ریت پر بھی سرگرم سفر کر، چشمہ زمزم کے اندر بھی غوطہ زن ہو۔ بلبل کی مانند
کب تک نالہ و زاری میں مست رہے گا، کب تک اپنا نشیمن باغوں میں بنائے رکھے گا۔ اے وہ
شخص! جس کے دام کی برکت سے ہما جیسا پرندہ بیش قیمت ہو جاتا ہے، تو کسی بلند پہاڑ کی چوٹی پر
اپنا آشیاں بنا۔ ایسا آشیانہ کہ بجلی اور کڑک جس کے پہلو میں ہوں، جو نر بازوں کے گھونسلوں سے
کہیں بلند ہو۔ تاکہ تو کش مکش حیات کے قابل ہو اور تیرا جسم اور جان آتش حیات سے سوزاں
ہو۔ (جاری ہے)

اسلامی نظام عدل کے نفاذ میں مشکلات اور ان کا حل

مولانا سید محمد متین ہاشمی

تدریج

جب سے پاکستان میں نفاذ شریعت کے عمل کا آغاز ہوا ہے ملک میں دو خیال کے لوگ پیدا ہو گئے ہیں۔

ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو اسلام اور نظام اسلام کو قصہ ماضی سمجھتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ موجودہ سائنسی دور میں اسلامی نظام کو نافذ ہی نہیں کیا جا سکتا اور اس کی کوشش کی گئی تو ہم صدیوں پیچھے چلے جائیں گے۔ اس نظریہ کے حاملین کی فہم کا یہ قصور ان کی مخصوص تعلیم و تربیت مخصوص ماحول اور اسلامی نظام سے عدم واقفیت کی بنا پر ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک کوئی شخص تفصیل سے کسی نظام کا مطالعہ نہیں کرتا وہ اس کے حسن و قبح سے کس طرح واقف ہو سکتا ہے۔ ایسے حضرات سے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

کنارے سے کبھی اندازہ طوفان نہیں ہوتا

اگر شریعت کی برکتوں کو سمجھنا ہے تو اس کے بحر بے کراں میں غوطہ لگائیں آپ کو خود اس کی عظمت کا اندازہ ہو جائے گا۔

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو اب بھی اسلام کو ایک زندہ جاوید اور قابل عمل نظام کے طور پر تسلیم کرتا ہے اور دل سے چاہتا ہے کہ اس ملک میں اسلامی شریعت اپنی تمام تر برکات کے ساتھ آئے۔ اس طبقے کو دین کے ساتھ دلی لگاؤ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی نے اسلامی نظام یا نظام مصطفیٰ کا نعرہ لگا کر اسے دعوت عمل دی وہ میدان میں اتر آیا اور اپنے خون سے ایسی تاریخ لکھ دی جسے وقت و زمانے کا کوئی انقلاب جھٹلا سکتا ہے نہ مٹا سکتا ہے اس طبقے کے خلوص پر ذرہ برابر شک نہیں کیا جا سکتا۔ شریعت اسلامیہ کے ساتھ والہانہ محبت ہی کا اثر ہے کہ یہ طبقہ چاہتا ہے کہ چشم زدون میں اسلامی نظام انقلابی اقدامات کے ذریعہ نافذ کر دیا جائے یہ بڑی مقدس آرزو اور مبارک خواہش ہے لیکن اس موقع پر یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ یہ طریق کار پر خطر بھی ہے۔ کیونکہ ایسے وقت میں جبکہ ٹرین ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار چل رہی ہو اگر فوراً بریک لگا دی جائے تو یہ بھی ممکن ہے ٹرین کھڑی ہو جائے اور اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ٹرین ہی الٹ

انقلاب یا ارتقاء

کسی نظام کے نفاذ کے دو ہی طریقے ہیں۔

ایک طریقہ انقلاب (Revolution) کا ہے اور دوسرا ارتقاء (Evolution)۔ اول الذکر طریقے میں تبدیلی فوری آتی ہے لیکن اس کے اثرات بھی عارضی اور سطحی ہوتے ہیں۔ جبکہ ثانی الذکر طریقے یعنی ارتقائی طریقے میں تبدیلی آہستہ آہستہ آتی ہے لیکن اس کے اثرات پائیدار اور دوررس ہوتے ہیں کیونکہ کسی قوم کے باطن کا بدل جانا کھیل نہیں ہوتا۔

انقلابی طریقے میں خوں ریزی ہوتی ہے اور ارتقائی طریقہ پر امن تبدیلی کا طریقہ ہے۔ انقلاب میں عمل کے ساتھ شدید قسم کے ردعمل کا بھی امکان ہوتا ہے۔ جبکہ ارتقائی طریقے میں اس کا امکان کم ہے۔

منہاج نبوت ''ارتقائی'' ہے انقلابی نہیں یہی وجہ ہے کہ یک بیک شراب حرام نہیں کردی گئی بلکہ شراب کی حرمت چار تدریجی مراحل میں ہوئی اسی طرح سود کی حرمت میں بھی تدریج کا طرز اختیار کیا گیا۔ رسم غلامی کو بھی تدریجاً ہی ختم کیا گیا۔

لہٰذا پاکستان میں بھی اسلامی نظام کو تدریجاً ہی نافذ کرنا مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

تدریب (ٹریننگ)

اب جبکہ ملک میں اسلامی حدود کا نفاذ ہو چکا ہے اور امید کی جارہی ہے کہ انشاء اللہ العزیز جلد اسلامی قانون قصاص اور اسلامی شہادت کا بھی نفاذ ہو جائے گا ضروری ہے کہ سرکاری سطح پر قاضیوں کی تربیت کا انصرام کیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ پاکستان کی متعدد معروف دینی درسگاہوں نے اس ضرورت کا احساس کرتے ہوئے قاضی کلاسوں کا اجراء کیا ہے اور اسلام آباد میں سرکاری اہتمام میں بھی یہ کام شروع ہوا ہے لیکن ابھی تک اس کام کی انجام دہی میں نظم ہے نہ باہمی ربط۔

لہٰذا ضروری ہے کہ قاضیوں کی تربیت کا وفاقی دارالحکومت اور صوبائی دارالحکومتوں میں حکومت کی نگرانی میں انتظام کیا جائے، اس کے لئے ماہرین کا ایک بورڈ تشکیل دیا جائے، ایک نصاب وضع کیا جائے، پھر اس نصاب کے تحت سرکاری اداروں اور معروف دینی درسگاہوں میں تدریس وتربیت کا انتظام کیا جائے۔ امتحانات کا ایک نظام حکومت کی نگرانی میں قائم ہو اور علمی استعداد کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا جائے کہ مستقبل میں قاضی بننے والا علمی اعتبار سے راسخ

العقیدہ اور صالح و متقی مسلمان ہے یا نہیں۔ کیونکہ قضا کی لئے محض علمی استعداد ہی کافی نہیں
بلکہ ضروری ہے کہ قاضی متقی، متدین اور بالغ نظر ہو۔

تدوین جدید

قرون اولیٰ میں جب اسلام زیادہ تر عرب کے علاقے تک محدود تھا۔ فقہ اسلامی کی تدوین
کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ عرب کا ماحول سیدھا سادہ تھا۔ صحابہ کرامؓ یا تابعین کی کثیر تعداد
موجود تھی جو ہر علاقے کے بسنے والوں کی دینی تربیت میں مشغول تھے۔ لیکن جب فتوحات کی
کثرت ہوئی اور مصری، ایرانی، کلدانی، ترکی، رومی، اور جنوبی ایشیاء کی اقوام دائرہ اسلام میں
داخل ہو گئیں تو معاشرہ پہلے کی طرح سیدھا سادہ نہ رہ گیا بلکہ اب نت نئے مسائل نے سر اٹھایا
عقلی موشگافیاں شروع ہو گئیں اور اسلام کا نظام عدل ایرانی و رومی نظام عدل کے بالمقابل آ گیا
اب ضرورت پیش آئی کہ اس عہد کے پیچیدہ معاشرے کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر باضابطہ طور پر
فقہ کی تدوین کی جائے اللہ تعالیٰ ہمارے فقہائے کرامؒ کی قبور کو انوار و برکات سے بھر دے کہ
انہوں نے ہمت نہ ہاری اور لکیر کے فقیر بنے نہ بیٹھے رہے بلکہ انہوں نے قرآن و سنت پر غور و فکر
کر کے ان سے اصولوں کا استخراج کیا اور ان کی بنیاد پر فقہ کا ایک عظیم الشان سرمایہ جمع کر دیا ایسا
سرمایہ کہ اس کی بنیاد پر بنو عباسیہ کی عظیم الشان سلطنتوں کا نظام چلتا تھا اور کبھی بھی فقہ اسلامی کے
بارے میں تنگ دامانی کا شکوہ نہیں گیا گیا۔ الحمد اللہ کہ آج وہ سارا علمی سرمایہ اپنی تمام تر جامعیت
کے ساتھ محفوظ ہے۔ البتہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ چونکہ چھٹی ساتویں صدی ہجری کے
بعد اجتہاد کا سلسلہ رک گیا تھا اس لئے ہماری فقہ میں یک گونہ جمود آ گیا۔ زمانہ ترقی کرتا رہا لیکن
فقہ اپنی جگہ پر جوں کی توں کھڑی رہی اس لئے ہماری فقہ کا بالخصوص وہ حصہ جس کا تعلق معاملات
اور قضا و احکام سے ہے کسی قدر آؤٹ آف ڈیٹ ہو گیا اگر چہ اس عرصے میں فتاویٰ عالمگیری اور
مجلۃ الاحکام العدلیہ جیسے بھی کام ہوئے تاہم معاشرہ جس تیزی سے پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے ان علمی
کاموں کو بھی کافی نہیں کہا جا سکتا۔

لہٰذا ضروری ہے کہ ہم اپنے فقہی سرمایہ کا از سر نو جائزہ لیں اور حالات حاضرہ کی روشنی میں
اس کی تدوین جدید کریں۔

فقہ کی تدوین جدید کے وقت مندرجہ ذیل امور کو اگر مدنظر رکھا جائے تو کم سے کم غلطی کا
امکان ہے۔

تیسیر

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:

یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (البقرہ۔۱۸۵)

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے وہ تمہارے لئے دشواری نہیں چاہتا"۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یسروا ولا تعسروا بشروا ولا تنفرو

ترجمہ: "آسانی پیدا کرنا دشواری نہ پیدا کرنا خوش خبری سنانا نفرت نہ دلانا"۔

ایک روایت میں ہے:

الدین یسرواحب الدین عنداللہ الحنیفیۃ السمحۃ

ترجمہ: "دین آسان ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ دین وہ ہے جو سیدھا اور آسان ہو"۔

[illegible] تدوین جدید کے وقت سنت کے مطابق احکام کا آسان ترین پہلو اختیار کرنا چاہیے اور جہاں ممکن ہو تنگی پیدا کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

عرف

ہمارے فقہائے سلف نے فقہ کی تدوین کے وقت اپنے دور اور اپنے علاقے کے عرف کو اہمیت دی تھی ظاہر ہے کہ ہمارے دور اور ہمارے علاقے کا عرف دوسرا ہے اس لئے ضروری ہے کہ فقہ کی تدوین جدید کے وقت ہم فقہائے سلف کی طرح اپنے عرف کو اہمیت دیں۔

علماء کا بورڈ

تدوین جدید کے لئے ضروری ہے کہ حکومت اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان کے زیر اہتمام ایک علماء بورڈ تشکیل دے جس میں:

(الف) ہر مکتب فکر کے جید علمائے دین کو شامل کیا جائے۔

(ب) ہر مکتب فکر سے ایسے علمائے دین کو شامل کیا جائے جو اسلامی قوانین میں کسی علمی حیثیت کے مالک ہوں نیز علم و فضل کے ساتھ ساتھ ورع و تقویٰ اور خلوص و دیانت کے اعتبار سے بھی مشہود لہم بالخیر ہوں۔

(ج) اس بورڈ میں جدید قوانین کے ایسے ماہرین کو بھی شامل کیا جائے جو اپنی دین پسندی میں معروف ہوں اور اس بات کے سچے دل سے خواہاں ہوں کہ جلد از جلد اسلامی نظام ملک میں

نافذ ہو۔

(د) ضروری ہے کہ یہ بورڈ ہر قسم کے سیاسی مفادات سے آزاد ہو۔

(ہ) بورڈ کے اراکین کو قیام وسکونت کی ہر ممکن سہولت بہم پہنچائی جائے اوران سے کل وقتی کارکن کے طور پر کام لیا جائے۔

بورڈ کے ارکان کو اختیار ہوگا کہ وہ جدید دور کے مسائل پر غور کرتے وقت قیاس، استحسان، استصحاب مصالح مرسلہ کے دائرہ کار کا آج کل کے حالات کی روشنی میں تعین کریں اور تدوین جدید کے وقت حسب ضرورت ان سے استفادہ کریں۔

تطہیر

گذشتہ صفحات میں اسلامی نظام عدل کے نفاذ کو آسان اور تیز تر بنانے کے لئے چند اقدامات تجویز کئے گئے ہیں، لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ کسی بھی نظام کو نافذ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسی ٹیم موجود رہے جو:

۱۔ اس نظام کی صداقت وافادیت پر یقین کامل رکھتی ہو۔

۲۔ جس نے اس نظام کے نفاذ کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے رکھا ہو۔

۳۔ جو اس نظام کے نفاذ اور قیام ودوام کے لئے اپنا سب کچھ تج دینے اور قربان کرنے کے لئے تیار ہو۔ ایسے لوگ جو بہ باطن اسلامی نظام کی صداقت وافادیت پر یقین نہ رکھتے ہوں۔ یا اسلامی نظام کو ایک فرسودہ نظام تصور کرتے ہوں ان سے یہ امید کرنا کہ وہ اس نظام کو نافذ کردیں گے ایک سراب کی طرف دوڑنے کے مترادف ہے۔

لہذا ضروری ہے کہ جس جماعت پر اسلامی نظام کے نفاذ کی ذمہ داری ڈالی جائے اس کی اچھی طرح تطہیر کرلی جائے۔ ورنہ تنفیذ کا کام شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔ (حاکم بدہن)

خلاصۃ الکلام

۱۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ مغرب کے نظام عدل کو ترمیمات کے ذریعہ اسلامی بنایا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ اسلام کے نظام عدل میں تصور انسان دوسرا اور مغرب کے نظام میں دوسرا اور تصور انسان ہی وہ بنیاد ہے جس پر قوانین کی تدوین عمل میں آتی ہے۔

۲۔ اسلام کا نظام عدل اپنے تصور انسان، صفت، دوام، مساوات، تصور آخرت وخوف خدا، نظام عقوبات، تصور قضا شہادت کے معیار اور سیدھے سادے طریق کار کی بنا پر دنیا کے تمام نظامہائے عدل سے ارفع اور فائق ہے۔

۔ یہ سمجھنا کہ اسلامی نظام کے نفاذ کی ذمہ داری صرف حکومت پر عائد ہوتی ہے غلط ہے
پاکستان کے ہر باشندے کی ذمہ داری ہے کہ جن بنیادوں پر اس مملکت کا قیام ہوا تھا انہیں
بصورت وبہر قیمت مستحکم کیا جائے اور اس کام کی انجام دہی میں ہر شخص حسب حیثیت اپنا فرض
ادا کرے۔

۔ ہمارا قدیم فقہی سرمایہ قابل فخر ہے تاہم بدلے ہوئے حالات میں فقہ کی تدوین جدید
ضروری ہے۔

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ قیام پاکستان کے ۳۵ سال بعد ہی سہی ملک میں اسلامی نظام کے
نفاذ کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ موجودہ حکومت باوجود داخلی و خارجی مشکلات وموانع کے اس سلسلے
میں پیش رفت کر رہی ہے۔

(الف) حدود اسلامی کا نفاذ
(ب) سود سے پاک بینکاری کے نظام کا قیام
(ج) وفاقی شرعی عدالت کا قیام
(د) نظام زکوٰۃ کا نفاذ
(ہ) نظام عشر کا نفاذ
(و) قومی لباس اور قومی زبان کی ترویج کے اقدامات
(ز) نظام قصاص ودیت اور اسلامی قانون شہادت کے نفاذ پر غور
(ح) مساجد ومدارس اسلامیہ کی سرپرستی
(ط) ملک میں پہلی مرتبہ تبلیغ اسلام کی مد میں ایک کروڑ کی رقم کا مخصوص کیا جانا۔

کیا یہ چیزیں ایک صبح نو، ایک حیات تازہ اور ایک نشاۃ ثانیہ کی خبر نہیں دے رہی ہیں۔ ان
حالات میں ہم میں سے ہر شخص کو اپنے فرض کا احساس کرنا چاہیے اور جس سے جتنا ہو سکے اسلامی
نظام کو قائم کرنے کی کوششوں میں حکومت کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔

قرآن میں ہے:

تعاونوا علي البر والتقویٰ

ترجمہ: ''نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا کرو''۔

فلاح یا نجات

صدرالدین

قرآن کریم انسان کے جسمانی قویٰ اور اس کی اخلاقی استعدادوں کی صحیح نشو ونما کے لئے لفظ فلاح استعمال کرتا ہے اور اسی کو انسان کی پیدائش کی غرض وغایت بیان کرتا ہے۔ **فلح الارض** کے معنی زمین کو پھاڑنے اور زراعت کے قابل بنانے کے ہیں۔ چنانچہ مصر میں مزارعین کو فلاحین کہا جاتا ہے۔ مزارع زمین میں ہل جوت کر اس کو سورج کی گرمی اور ہوا اور پانی سے مستفید ہونے کے قابل بناتا ہے تاکہ اس کے جوہر بیدار ہو کر بیج کی اچھی طرح نشو ونما کر سکیں۔ بیج میں پودے یا درخت کے اجزا مخفی طور پر موجود ہوتے ہیں۔ پودے یا درخت کے جو حصص بیج میں مخفی طور پر موجود ہوتے ہیں وہی زراعت کے ذریعہ نشو ونما پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ بیج کے مخفی حصص پودے یا درخت کی شکل میں نمودار ہو جاتے ہیں۔ شاخیں، پتے، پھل۔ پھول جو اب نظر آنے لگتے ہیں یہ سب بیج میں موجود تھے۔ اور جو چیز بیج میں پہلے سے موجود نہ ہو اس کا پیدا کرنا امر محال ہے۔ گندم از گندم بروید جو از جو۔ یہی حال انسان کے قلب کا ہے۔ خدا تعالیٰ نے انسانی قلب میں بہت سی استعدادیں ودیعت کر رکھی ہیں ان استعدادوں کی نشو ونما انسان کی زندگی کی اصل غرض وغایت ہے۔ اس کا حصول اس کی زندگی کو کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ ببول کا درخت بو کر ہم توقع نہیں کر سکتے کہ اس کو آم کا پھل لگے اور جب ہم آم کی گھٹلی زمین کی سپرد کرتے ہیں تو ہمیں یقین تام ہوتا ہے کہ اس سے کبھی بھی ببول کا درخت پیدا نہ ہوگا۔ خدا تعالیٰ کا جو قانون نباتات میں کام کرتا ہے وہی قانون حیوانات میں اور انسانوں میں کام کرتا ہے۔ ہم ہزار کوشش کریں کہ بھیڑئے کے بچے کی پرورش سبزی سے کر کے اس کو بھیڑ کا بچہ بنا دیں۔ مگر ہم ہرگز کامیاب نہ ہونگے اس طرح بھیڑ کے بچے کو نہ گوشت کھلا سکیں گے اور نہ ہی اس میں درندگی پیدا کر سکیں گے۔ بطخ کا بچہ پہلے ہی دن پانی دیکھ کر اس میں کود پڑتا ہے۔ مگر مرغی کے بچہ میں پانی کے لئے کوئی کشش نہیں ہے۔ اگر وہ اتفاق سے پانی میں گر جائے تو مر جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو قویٰ جانداروں میں ودیعت کئے ہوں صرف انہی کی تربیت کی جا سکتی ہے اور وہی ان کی زندگی کی غرض ہوتی ہے اور جو قویٰ اور صفات ان میں سرے سے معدوم ہوں وہ قویٰ ان میں پیدا نہیں کئے جا سکتے۔ گھوڑے کی تربیت کی جا سکتی ہے کیونکہ اس میں تربیت سے متاثر ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ گھوڑے کو سواری کے قابل بنایا جاتا ہے۔ اس کو گھڑ دوڑ کی

دی جاتی ہے۔ اس کو میدان حرب کے لئے سدھایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس جانور میں ہمت و حوصلہ اور شجاعت موجود ہے۔ لیکن بیلوں کا رسالہ بنانے کا خیال مضحکہ خیز ہوگا کیونکہ بیل میں یہ صلاحیت موجود نہیں کہ اس کو گھوڑے کی طرح میدان کارزار میں استعمال کیا جا سکے۔ کتے سے حفاظت کا کام لیا جاتا ہے۔ اس کو شکار کرنا سکھایا جاتا ہے اس کو مجرم کا سراغ لگانے کے لئے سدھایا جاتا ہے اس کی ایک قسم گولڈن ریٹریور ہے۔ جس میں دبے ہوئے انسانوں کو باہر نکال لانے کی صلاحیت ہے مگر یہ مفید کام بھیڑ بکری سے نہیں لئے جا سکتے۔ یہی قانون انسانوں کی تعلیم و تربیت میں کام کرتا ہے انسانی قویٰ اور استعدادوں اور اخلاق کو کامل تک پہنچا دینا ہی انسان کی پیدائش کی غرض و غایت ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کے انسان کی طرح ہاتھ پاؤں وغیرہ نہیں ہیں اس لئے انسان کا خدا تعالیٰ کی صورت پر پیدا ہونے کا مطلب اس کی صفات پر پیدا ہونا ہے امام ... کے نزدیک انسان کے خدا کی صورت پر پیدا ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہے اس لئے اس کا خلیفہ فی الارض ہے اور اس مضمون کو یہ آیت کریمہ بھی ادا کرتی ہے

فطرة الله التی فطر الناس علیها لا تبدیل لخلق الله۔

اس آیت کریمہ میں فطرۃ انسانی کو فطرۃ اللہ کہنے سے اس کی عظمت کا اظہار کرنا مقصود ہے فطرۃ انسانی پاکیزہ اور مطہر ہے کیونکہ اس فطرت میں خدائی صفات ودیعت کی گئی ہیں۔ ان صفات کی تعلیم و تربیت کرنا انسان کو کامل تک پہنچاتا ہے اور یہی اس کی پیدائش کی غرض و غایت اور یہی اس کے عروج کا منتہی ہے۔ حضرت نبی کریم ﷺ نے اس ضمن میں فرمایا:

انی بعثت لا تمم مکارم الاخلاق

میری رسالت و نبوت اور میری بعثت کی غرض یہ ہے کہ انسان کے اخلاق کو کمال تک پہنچاؤں۔ انہوں نے اپنی بعثت کی اس غرض کو پورا کرنے کی سعی کی اور اپنی سعی کو بار آور ہوتے دیکھ لیا۔ ان کی تعلیم و تربیت کی برکت سے ساربانوں میں حکمرانی کی بہترین استعدادیں پیدا ہوگئیں۔ عرب کے جاہل لوگ علماء و فضلاء بن کر اہل یورپ و دیگر ممالک کے معلم بن گئے اور وہ لوگ جو اکھڑ تھے فرشتہ سیرت بن گئے رسول کریم ﷺ نے جہاں انسان کی پیدائش کی غرض کو

فلسفیانہ رنگ میں بیان فرمایا وہاں اس کو عملی شکل دینے میں پوری کامیابی حاصل کر کے دکھادی ان تاریخی حقائق وشواہد کے پیش نظر اس زمانہ کے روشن دماغ لوگ ضرور اس عظیم الشان شخصیت کو زمانہ حال کا پیغمبر یقین کریں گے۔

نجات

سعادت دنیوی وسعادت اخروی کے حصول کا طریق جو حضور نبی کریمؐ نے بیان فرمایا ہے پیش کرنے کے بعد اس طریق کا بیان کرنا فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔ جو عیسائیت کے متبعین بیان کرتے ہیں وہ سعادت اخروی کو نجات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں نجات کے معنی انسان کو کسی مصیبت سے بچالینے کے ہیں مثلاً ڈوبتے کو بچالینا یا کسی جان کو اس مکان سے نکال لینا جس کو آگ لگ گئی ہو۔ یا کسی شخص کو کنویں یا کھڈ سے نکال کر ہلاک ہونے سے بچالینا وغیرہ وغیرہ۔ غرض نجات کے معنی مصیبت سے بچالینے کے ہیں اور بس۔ نجات میں انسان کی اخلاقی وروحانی تعلیم وتربیت شامل نہیں۔ بچالینے کے بعد انسان کے لئے کونسا لائحہ عمل ہے۔ اس کی طرف موجودہ عیسائیت کچھ نشاندہی نہیں کرتی۔ عیسائی علماء کہتے ہیں خدا تعالیٰ ایک عرصہ سے نبی اور رسول بھیجتا رہا۔ جنہوں نے مخلوق کو خدا تعالیٰ کی عبادت کرنے کا سبق دیا اور اخلاق فاضلہ کے حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ لیکن تجربہ نے خدا پر واضح کر دیا کہ رسالت ونبوت کا سلسلہ مفید نہیں ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے اس طریق کو ترک کر دیا۔ اور لوگوں کی نجات کے لئے اپنا بیٹا دنیا میں بھیج دیا جس نے صلیب کی لعنتی موت اختیار کر کے ساری مخلوق کے گناہوں کا بوجھ اپنی پیٹھ پر اٹھالیا۔ اور اس نے تین دن ہاویہ میں گزارے۔ عیسائی علماء اس ناقابل فہم عقیدہ پر دلائل کی روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں۔ اس عقیدہ کی رو سے خدا کی مقدس ومقتدر ذات کے متعلق یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ خدائے علیم وحکیم اپنے بندوں کو اخلاق فاضلہ سکھانے کے لئے اپنے انبیاء بھیجتا رہا۔ پھر اس نے اپنے اس فعل کو غیر مفید پا کر اپنے علم وحکمت پر افسوس کیا اس لئے دوسرا طریق نکالا۔ وہ یہ کہ اپنے معصوم بچے کو لعنتی موت کی سزا دی اور اس کو تھوڑے عرصہ کے لئے ہاویہ میں بھیج دیا۔ مگر خدا کی یہ تجویز بھی کارگر نہ ہوئی۔ کیونکہ عیسائی علماء دنیا کو یقین دلاتے ہیں کہ انسانیت کا صرف وہ حصہ نجات پائے گا جو حضرت عیسیٰ کی صلیبی موت پر ایمان رکھتا ہے اور انسانیت کا باقی حصہ دوزخ میں بھیج دیا جائے گا۔ اس سے یہ امر عیاں ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو دوسرا طریق

نجات اختیار کیا تھا۔ وہ بھی پورے طور پر کامیاب نہیں ہوا۔ کیونکہ اس سے ساری انسانیت مستفیض نہیں ہوئی بلکہ ایک بڑا حصہ دوزخ کا ایندھن بنارہا آیئے اب اس حصہ انسانیت پر غور کریں جو حضرت عیسیٰ کی صلیبی موت کے فوائد کا قائل ہے اور اس کو نجات کا موجب ٹھہراتا ہے۔ اس حصہ میں دونوں قسم کے لوگ موجود ہیں۔ وہ بھی جو نیک و پارسا ہیں اور مخلوق خدا کی خدمت کر رہے ہیں لیکن وہ بھی ہیں جو شرابی، بدکردار، بددیانت اور ڈاکو قسم کے لوگ ہیں۔ اور دونوں قسم کے لوگ ہر اس قوم میں بھی پائے جاتے ہیں جس میں خدا تعالیٰ کی جناب سے نبی اور رسول مبعوث ہوئے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ان حقائق و شواہد کے معترف ہیں۔ کہ " دنیا میں نیک و بد دونوں ہوتے ہیں، اور دونوں قسم کے لوگوں پر خدا کا سورج چمکتا اور دونوں پر اس کے کرم سے بارش نازل ہوتی ہے"۔ وہ کہتے ہیں " طبیب بیماروں کے لئے ہوتا ہے نہ کہ تندرستوں کے لئے"۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزدیک بعض انسان بیمار ہوتے ہیں اور اکثر تندرست ہوتے ہیں یعنی بعض لوگ روحانی و اخلاقی اقدار کے مالک بھی ہوتے ہیں وہ فرماتے ہیں بچے معصوم ہوتے ہیں اور جنت ایسوں ہی کے لئے ہے وہ تلقین فرماتے ہیں کہ " اے لوگو تم بچوں کی طرح معصوم ہو جاؤ۔ تم اپنی روایت سے خدا کا حکم کیوں ٹال دیتے ہو" اور فرمایا " پس تم نے اپنی روایت سے خدا کا حکم باطل کر دیا" اور یہی مضمون مرقس میں درج ہے۔ جس سے ظاہر ہوا کہ حضرت عیسیٰ انسان کو گنہگار نہیں سمجھتے بلکہ وہ اس کے برعکس تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ " مبارک ہیں وہ جو کہ پاک دل ہیں کیونکہ وہ خدا کو دیکھ سکیں گے" اس سے آگے وہ ترقی کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ " تم خدا کی صفات میں رنگین ہو جاؤ" حضرت عیسیٰ کی یہ تعلیمات معقول ہیں اور پادریوں کے اس خیال کی تردید کرتی ہیں کہ خدا نے نبوت و رسالت کے سلسلہ کو غیر مفید سمجھ کر انسانیت کی نجات کے لئے نیا طریق اختیار کیا اور اپنے معصوم فرزند پر لعنتی موت وارد کی۔ پادریوں کے اس خیال کے برخلاف حضرت عیسیٰ فرماتے ہیں " اس لئے خدا کی حکمت نے کہا کہ میں نبیوں اور رسولوں کو ان کے پاس بھیجونگی"۔ اور اسی معقول و پر حکمت طریق کی حمایت کرتے ہوئے فرمایا " شریعت کا ایک شعشہ بھی تبدیل نہ ہوگا"۔ اور فرمایا حکموں پر چلنے سے نجات حاصل ہوتی ہے اور فرمایا جو لوگ اس کے خلاف عقائد رکھتے ہیں وہ خدا کے حکم کو باطل قرار دیتے ہیں غرض حضرت عیسیٰ وہی اعتقاد تلقین فرماتے ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تلقین فرماتے ہیں حضرت عیسیٰ

اور حضرت محمد ﷺ دونوں خدا تعالیٰ کے برگزیدہ انبیاء میں سے تھے۔ دونوں ایک ہی چشمہ معرفت سے سیراب تھے اور دونوں کی تعلیم بھی اصولاً ایک ہی تھی چنانچہ قرآن کریم میں یہی تلقین کی گئی ہے کہ انسان کو چاہیے کہ اپنے تئیں خدا کی صفات سے رنگین کرے فرمایا **صبغة الله ومن احسن من الله صبغة** ۔خدا تعالیٰ کی صفات کا رنگ اپنے اوپر چڑھاؤ بھلا خدا کے رنگ سے اور کونسا رنگ بہتر ہوسکتا ہے۔اس سارے بیان کا ماحصل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے نزدیک سعادت اخروی اعمال حسنہ سے نصیب ہوتی ہے وہ نہایت واضح الفاظ میں تلقین فرماتے ہیں ’ہر ایک آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگا مگر وہی جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتا ہے‘‘۔اور فرماتے ہیں کہ’’راستباز ہمیشہ کی زندگی پائیں گے‘‘۔نیز فرماتے ہیں’’اگر زندگی میں داخل ہونا چاہتے ہو تو حکموں پر عمل کرو‘‘۔اور فرمایا’’اگر تمہاری راستبازی فقیہوں اور فریسیوں کی راستبازی سے زیادہ نہ ہوگی تو تم آسمان کی بادشاہت میں ہرگز داخل نہ ہوگے‘‘۔وہ فرماتے ہیں ’’حقیقی طور پر راستبازی اختیار کرو کیونکہ راستباز اپنے باپ کی بادشاہی میں آفتاب کی مانند چمکیں گے‘‘۔پھر فرماتے ہیں’’جس کے کان ہوں وہ سن لے راستباز ہمیشہ کی زندگی پائیں گے‘‘۔

حیرت ہوتی ہے جب ہم ان واضح تعلیمات کے خلاف پادری صاحبان کو یہ تلقین کرتے ہوئے سنتے ہیں کہ نجات کا انحصار عمل پر نہیں ہے بلکہ حضرت عیسیٰ کی صلیبی موت پر ایمان لانے پر ہے۔یہ کس قدر جسارت ہے کہ پادری صاحبان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی معقول تعلیمات کو پس پشت ڈال رہے ہیں اور اپنے علماء کی روایت کو حضرت عیسیٰ کی تلقین پر ترجیح دیتے ہیں۔حضرت عیسیٰ نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا ہے’’تم نے اپنی روایت سے خدا کا حکم باطل کر دیا ہے‘‘اور یہی تلقین مرقس میں اس طرح درج ہے’’تم خدا کے حکم کو ترک کر کے آدمیوں کی روایت کو قائم کرتے ہو۔تم اپنی روایت کو ماننے کے لئے خدا کے حکم کو بالکل رد کرتے ہو‘‘۔

حضرت عیسیٰ نے فرمایا۔ہر شخص جو مجھے خداوند خداوند کر کے پکارتا ہے۔خدا کی بادشاہی میں داخل نہ ہوگا۔مگر وہی جو میرے آسمانی باپ کی مرضی پر چلتا ہے۔ان تمام آیات میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس بات پر زور دیا ہے کہ سعادت اخروی کا انحصار نیک اعمال پر ہے نہ کہ میرا دامن پکڑ لینے پر غرض انہوں نے کبھی اپنے تئیں وسیلہ یا واسطہ کر کے پیش نہیں کیا،اور نہ ہی اپنے لئے نجات دہندہ کا لفظ استعمال کیا۔

مغرب نے عورت کو کیا دیا؟

سید جلال الدین عمری

۳۔ عورت کی تگ و دو صرف معاشی میدان ہی میں نہیں رہی بلکہ آہستہ آہستہ معاشرتی، سماجی اور تہذیبی امور میں بھی وہ مرد کی شریک ہوگئی۔ وہ کارخانوں، دفتروں اور کالجوں میں مرد کے شانہ بشانہ معاشی جدوجہد کر رہی تھی تو پارکوں، کلبوں سینما گھروں اور تفریح گاہوں میں اس کے ساتھ کھیل کود اور تفریح میں بھی حصہ لے رہی تھی۔ اس کا وجود ہر شعبہ حیات میں ضروری قرار پایا اور اس کے بغیر زندگی بے کیف اور بے لطف تصور کی جانے لگی۔ اس سے اختلاط مرد و زن بڑھا، بدکاری عام ہوئی اور ایک ایسی ننگی اور بے حیا تہذیب نے جنم لیا کہ اس کی عفونت اور بدبو سے اخلاق کا چمن اجڑ گیا اور شرم و حیا اور شرافت کا دم گھٹ کر رہ گیا۔

تاریخ کا تجربہ ہے کہ جب بھی عورت گھر سے نکل کر شمع انجمن بنی اور مجلسوں اور محفلوں کی رونق بڑھانے لگی تو جنسی آوارگی پھیلی، جو گندگی بند کمروں میں برداشت نہیں کی جاسکتی وہ بازاروں اور سڑکوں میں پھیلنے لگی، انتہائی قابل احترام اور پاکیزہ رشتے بھی اس سے محفوظ نہیں رہے۔ عام انسانوں کا ذکر ہی کیا ان کے دیوی دیوتا تک بدکاریوں میں ملوث پائے گئے اور ان کی طرف ایسی ایسی داستانیں منسوب کی جانے لگیں کہ آدمی شرم سے پانی پانی ہو جائے۔ بیواؤں اور رنڈیوں کو وہ مقام حاصل ہوا جس سے شریف عورتیں تک محروم تھیں، آرٹ اور کلچر سے جنسی جذبات کی ترجمانی ہونے لگی، عریاں تصویریں کھینچیں، ننگے مجسمے تراشے گئے۔ رقص و موسیقی کے نام پر عورت سے لذت حاصل کی گئی، افسانہ، ڈرامہ، شاعری اور ادب کے ذریعہ جنسی اعمال و کیفیات کی تشریح ہونے لگی، عورت مرد کے ہاتھ میں کھلونا بن گئی اور اس کا مقصد صرف یہ رہ گیا کہ مرد کی جنسی خواہش کی تکمیل کرے غرض پوری تہذیب جنس کی ترجمان بن گئی اور اسی کے ارد گرد گھومنے لگی۔ جنسی جذبات کی اس حکمرانی نے یونان، روم، مصر اور دوسری بہت سی قدیم تہذیبوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ تہذیب نو بھی اسی راستہ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ شاید وہ وقت قریب آ گیا ہے جب کہ یہ قصر منہدم ہو جائے اور ایک نئی تہذیب وجود میں آئے۔

۴۔ خاندانی نظام عورت کی وجہ سے قائم تھا۔ اس کے اندرونی نظم و نسق کو وہ سنبھالے ہوئے

تھی عورت کی تنگ ودو جب گھر سے باہر ہونے لگی اور بیرونی مصروفیات نے اس کے اوقات کو گھیر لیا تو خاندان کا نظم بکھر گیا۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا اس کی قیمت گھر کی بربادی کی شکل میں اسے ادا کرنی پڑی۔ خاندان، معاشرہ کا بنیادی پتھر ہے جب یہ اپنی جگہ سے ہٹا تو پورا معاشرہ درہم برہم ہو گیا۔ عورت مرد کے لئے وجہ سکون تھی اب نہیں رہی، ان کے درمیان وہ محبت نہیں رہی جس کی وجہ سے زندگی کے نشیب وفراز میں وہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ والدین اور اولاد کا مضبوط رشتہ کمزور پڑ گیا۔ اولاد کے لئے والدین مرکز محبت ہوتے ہیں، یہ مرکز ان سے چھن گیا اور وہ نرسنگ ہاؤس کے حوالے ہو گئے، والدین کے بڑھاپے کا سہارا ان کی اولاد ہوتی ہے، یہ سہارا ٹوٹ گیا اور وہ انتہائی بے بسی اور کسمپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ یہی نہیں وہ سارے تعلقات جو خاندان کی بقا کے ساتھ وابستہ تھے اس کے ٹوٹتے ہی ختم ہوتے چلے گئے اور انسان اس سکون سے محروم ہو گیا جو صرف خاندان ہی فراہم کر سکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ عورت کی آمدنی کیا اتنی قیمتی ہے کہ اس کے لئے وہ اور پورا معاشرہ اتنا بڑا نقصان برداشت کرے؟

اسلام نے عورت کے بارے میں غلط تصورات کی تردید کی اور ایک معتدل اور متوازن فکر پیش کیا ہے اس سے مغرب کے موجودہ مساوات مرد وزن کے نظریہ کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ کام جس طرح ہونا چاہیے نہیں ہو سکا۔ اس کے ماننے والوں کی ایک بڑی تعداد مختلف اسباب کی بنا پر مغرب کے ہر فلسفے کو مرعوبیت کے ساتھ قبول کرتی چلی گئی۔ وہ مغرب کے نظریہ مساوات مرد وزن کی اصلاح کیا کرتے اسلام کی تعلیمات ہی میں انہیں خامیاں نظر آنے لگیں۔ بعض نے کھل کر ان تعلیمات ہی کو ناموزوں قرار دے دیا اور بعض نے تاویل وتوجیہہ کے ذریعہ اس کی صورت مسخ کر دی۔

اسلام ایک مضبوط اور پائیدار خاندان کو معاشرہ کی بقا کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ اس کا ایک پورا نظام اس نے قائم کیا ہے، اس کی تفصیلات بتائی ہیں اور حدود وضوابط متعین کئے ہیں۔ وہ اس بات کی شدت سے تاکید کرتا ہے کہ اس نظام کو جوں کا توں رکھا جائے اور اللہ کی قائم کردہ حدود نہ توڑے جائیں۔ اس نظام میں عورت کی بنیادی اہمیت ہے۔ اس کے حقوق بھی ہیں اور فرائض بھی

گر وہ اس سے کنارہ کش ہو جائے اور یکسوئی کے ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا نہ کرے تو یہ نظام بکھر کر رہ جائے۔ وہ اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب کہ عورت اسے اپنی سعی و جہد اور توجہ کا مرکز بنائے رکھے۔

اسلام معاش کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ عورت معاشی لحاظ سے کمزور نہ ہو بلکہ اس کی معاشی حیثیت مستحکم رہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ وہ یکسوئی کے ساتھ خاندانی فرائض انجام دیتی رہے اور معاشی مصروفیات کی وجہ سے وہ ان سے بے رخی یا غفلت برتنے پر مجبور نہ ہو جائے۔ اس کے لئے اس نے حسب ذیل تدابیر اختیار کی ہیں۔

۱۔ عورت پر کوئی معاشی ذمہ داری نہیں ڈالی۔ صرف یہی نہیں کہ اس پر اپنی اولاد، ماں باپ یا کسی قریب سے قریب رشتہ دار کی معاش کا بوجھ نہیں ہے۔ بلکہ خود اس کی معاشی ذمہ داری بچپن میں اس کا باپ اٹھاتا ہے۔ شادی کے بعد یہ ذمہ داری شوہر پر عائد ہوتی ہے اور شوہر کے انتقال یا اس سے علیحدگی کے بعد اولاد اس کے معاش کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اولاد اس قابل نہ ہو تو باپ یا قریبی محرم کو اس کی کفالت کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔

۲۔ اسے وراثت کا حق دیا۔ ماں باپ، شوہر اور اولاد کے مال میں اسے یہ حق لازماً ملتا ہے۔ بعض اوقات بھائی بہن کے مال میں بھی وہ وراثت کی حقدار ہوتی ہے۔ اسی طرح شوہر کی طرف سے اسے مہر ملتا ہے۔ وہ ان زیورات اور تحفے تحائف کی بھی مالک ہوتی ہے۔ جو شادی یا خوشی کے دیگر مواقع پر اسے دیئے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس کا محفوظ سرمایہ ہے۔

۳۔ اس محفوظ سرمایہ کو عورت خاندانی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے اسلامی حدود کے اندر تمام نفع بخش کاموں میں لگا سکتی ہے۔ اس سے ہونے والی آمدنی پوری کی پوری اسی کی ہے۔ اس کا کوئی کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔

ان ذرائع سے عورت کی آمدنی میں مستقل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس پر کوئی معاشی ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے اس کی اوپری آمدنی محفوظ ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب کہ مرد پر گوناگوں معاشی ذمہ داریاں ہیں جو کچھ کماتا ہے اس کا بڑا حصہ ان ذمہ داریوں کے ادا کرنے پر اسے خرچ کرنا پڑتا ہے۔

اس طرح اسلام کے خاندانی نظام میں معاشی جد و جہد کے لئے عورت گھر چھوڑنے اور اس کی ذمہ داریوں کو بالائے طاق رکھنے پر مجبور نہیں ہوتی اور اس سے وہ سماجی اور اخلاقی خرابیاں بھی پیدا نہیں ہوتیں جو عورت اور مرد کے ایک ساتھ مل کر معاشی دوڑ دھوپ کرنے سے پیدا ہوتی ہیں۔

آخری بات یہ کہ مرد نے عورت پر بے شک بڑی زیادتیاں کی ہیں۔ لیکن اس کی ساتھ ساتھ اس کی اندر عورت سے محبت کا ایک فطری جذبہ بھی ہے۔ اسلام اس جذبہ کو ابھارتا اور نشو ونما دیتا ہے۔ وہ اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ عورت کے قانونی حقوق ہی ادا نہ کئے جائیں بلکہ اس کے ساتھ ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جائے وہ حسن سلوک کی مستحق ہے لہٰذا اس کے ساتھ حسن سلوک ہی ہونا چاہیے۔ اس جذبہ کی عورت اور مرد کے تعلقات میں اساسی اہمیت ہے۔ موجودہ دور میں عورت اور مرد کے درمیان حقوق کی جنگ نے اس جذبہ کو مجروح اور نیم جان کر دیا ہے اور کبھی کبھی تو یہ احساس ہوتا ہے کہ شاید وہ دم توڑ چکا ہے، اس سے عورت کو بڑا نقصان ہوا۔ اس لئے کہ صرف قانون چاہے وہ آب زر سے کیوں نہ لکھ دیا جائے اس کے مسائل حل نہیں کر سکتا اسی کا نتیجہ ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان مساوات کا دعویٰ تو کیا جاتا ہے لیکن عملاً مساوات برتی نہیں۔ قانون نے اسے جو سیاسی سماجی اور معاشرتی حقوق دیتے ہیں ان سے وہ پوری طرح بہرہ یاب نہیں ہے اور کہیں کہیں تو اس پر ظلم و زیادتی آخری حد کو پہنچ چکی ہے۔ مرد کی خواہشات کی تکمیل کے لئے اس کی باقاعدہ خرید و فروخت ہو رہی ہے، اس کی جان و مال پر حملے ہو رہے ہیں اور اس کی عصمت و آبرو بھی بے دریغ لوٹی جا رہی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قدم قدم پر ہونے والے نت نئے حملوں کا دفاع کرنا بھی اسے دشوار ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی کمزور کے حقوق تسلیم کر بھی لئے جائیں تو ان سب کا اسے ملنا آسان نہیں ہے۔ عورت لڑ کر یہ حقوق مرد سے حاصل نہیں کر سکتی۔ وہ اسے صرف اسی صورت میں مل سکتے ہیں جب کہ مرد انہیں دینا چاہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر ہمدردی اور محبت کا جذبہ ہو اور وہ عورت کے ساتھ زیادتی کو جرم اور گناہ سمجھے۔ اسلام نے اس معاملہ میں بے نظیر کامیابی حاصل کی ہے۔ تاریخ کے اس تجربہ کو جب بھی دہرایا جائے گا معاشرہ میں ایک بار پھر وہی بہار آئے گی جسے دنیا اس سے پہلے دیکھ چکی ہے۔

شرعی سزاؤں کی اہمیت

حضرت مولانا محمد اشرف

قانون کا منشاء

دنیا میں جو قانون بنائے جاتے ہیں ان کا منشاء سوسائٹی کی اعلیٰ اقدار کا تحفظ، مفادات عامہ کی حفاظت اور امن وامان کی بقاء اور ایک دوسرے کے جان ومال وآبرو کا بچاؤ ہوتا ہے۔

مغرب نے انسان کو ایک ''بڑھیا حیوان'' قرار دیا ہے۔ انگریزی کا مشہور قول ہے کہ (A Man is a Social Animal) (انسان ایک معاشرہ پسند حیوان ہے) سوسائٹی کے اس بڑھیا جانور کو سدھانے اور حدود دانسانیت کا پابند بنانے کے لئے حدود وقیود کی ضرورت پڑتی ہے اور اس طرح قوانین وجود میں آتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ انسان معاشرہ میں رہتا ہے۔ سوسائٹی میں افراد کے روابط ایک دوسرے سے قائم ہوتے ہیں، اگر ان روابط کو ضوابط کا پابند نہ کیا جائے تو انسانی زندگی اور جنگل کی زندگی میں فرق نہ رہے۔ باہمی میل ملاپ حقوق وفرائض کو پیدا کرتے ہیں، کہ باہمی مفادات جب ٹکراتے ہیں تو حقوق کی نشاندہی کرنی پڑتی ہے۔ جب حقوق پیدا ہوتے ہیں اور فرائض لازم آتے ہیں تو حقوق وفرائض، عادلانہ قوانین کی تشریح وتنقید چاہتے ہیں۔ اس لئے فرد وجماعت کے مفادات کی نگہداشت سوسائٹی کے اعلیٰ حقوق کی حفاظت اور نظم وضبط کی بقاء کے لئے قوانین بنائے جاتے ہیں (Solon) سولن سے لے کر موجودہ دور تک کے سب مقنن اس پر متفق ہیں کہ اگر انسانی معاشرہ کو انارکی وحشت اور بہیمیت سے بچانا ہے تو مجموعہ کے مفاد پر فرد کا وہ مفاد قربان کیا جائے گا جو ''مفاد عامہ'' سے ٹکراتا ہے اسے نقصان پہنچاتا ہے اور ضائع کرتا ہے۔

قانون اور مفادات عامہ

وہ فرد وگروہ جو اپنے مفادات ومقاصد خاصہ کے لئے سوسائٹی کے حقوق کو ضائع وپامال کرتا ہے۔ اور جماعت کے امن وامان کو برباد کرتا ہے اور اس کی عزت وآبرو اور جان ومال کے درپے ہوتا ہے۔ وہ سوسائٹی کا من حیث المجموع مجرم ہے۔ معاشرہ کا فرض ہے یہ ایسے ظالم اور وحشی کو اس کے برے کام سے روکے۔ ورنہ پوری سوسائٹی اس سے نقصان اٹھائے گی اور ممکن ہے کہ اس کا یہ قبیح فعل پوری سوسائٹی کو لے ڈوبے۔ انسانیت کو سب سے بڑا عادلانہ قانون دینے والے اور نفسیات انسانی کے سب سے بڑے ماہر ﷺ نے اس حقیقت کو ایک تمثیل میں پیش کیا ہے۔ اور فرمایا ''اس شخص کی مثال جو اللہ کی حدود (یعنی احکام) کا قائم کرنے والا اور وہ شخص جو اللہ تعالیٰ

کے احکام کا توڑنے والا ہے۔ اس کی مثال ایسی قوم کی ہے جنہوں نے ایک (دومنزلہ) جہاز میں قرعہ اندازی سے اپنی جگہیں مقرر کی ہوں۔ بعض اوپر کی منزل اور بعض نچلی منزل میں ٹھہرے ہوں۔ وہ لوگ جو نچلی منزل میں ہیں جب انہیں پانی کی ضرورت پڑتی ہے، پانی کے لئے اوپر کی منزل پر گزرتے ہیں پس اگر وہ یوں کہیں کہ ہم اپنے حصہ جہاز میں سوراخ کر لیتے ہیں تو سب کے سب ہی ہلاک ہو جائیں گے۔ اور اگر وہ نچلے آدمیوں کا ہاتھ پکڑ کر روک دیں تو وہ بھی بچ جائیں گے اور باقی سب بھی بچ جائیں گے (ورنہ سب ہلاک ہو جائیں گے)"۔ (بخاری، ترندی)

انسدادی اقدام کی ضرورت

غرض ایسے "مجرم" فرد وگروہ سے نپٹنے کے لئے اور اس کے شر سے سوسائٹی کو بچانے اور سوسائٹی کے دیگر افراد کو ایسے افعال قبیحہ سے روکنے کے لئے ہر وہ قدم دُرست و مناسب ہوگا۔ جو اس فعل قبیح کی شناخت کے بقدر اس سوسائٹی کے دشمن "وحشی" کو کیفر کردار تک پہنچا سکے اور آئندہ کے لئے اسے خود بھی اس عمل سے روک دے اور سوسائٹی کے دیگر افراد بھی اس سزا کو دیکھ کر ایسے اعمال سے بچ جائیں۔ گویا آج کے قانون کی اصطلاح میں (Deterent Punishment) ہے۔ یعنی وہ سزا جس کا مدعا افعال قبیحہ سے مجرم اور دیگر افراد کو روکنا ہے۔ سزا کا اصلاحی Reformative نظریہ جس سے "روک" سے بالکل اغماض برتا جائے اور جس کے تحت میں نرمی مجرم سے ہمدردی کارفرما ہو۔ وہ انسانی نفسیات کے "مجرمانہ" پہلوؤں پر نگاہ نہیں رکھتا۔ ایسے قوانین میں ہمیشہ ایسا رخنہ (Loo Phole) رہ جاتا ہے۔ جو سزا کے مقصد ہی کو فوت کر دیتا ہے۔ مجرم کے ساتھ "نرمی" و ناجائز ہمدردی غیر مجرموں کے ساتھ ظلم و زیادتی کے مترادف ہے۔ اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا:

انصرا خاك الظالم اوالمظلوم اپنے بھائی کی مدد کرو (خواہ) وہ ظالم ہو یا مظلوم اور لوگوں کے سوال پر ظالم کی مدد کا یہ مطلب بتایا کہ اسے ظلم سے روک دو کہ یہی اس کی اصل مدد ہے۔

نرم قانون کا اثر

آج یورپ و امریکہ میں جہاں قوانین کی تشکیل میں یہ ہمدردانہ نظریہ کارفرما ہے۔ عدل و انصاف کے اصل تقاضے پامال ہو رہے ہیں اور جرائم کی رفتار روز افزوں ہے۔ بلکہ جرم کا عمومی رجحان بڑوں کے علاوہ چھوٹوں میں بھی پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قتل، ڈکیتی، چوری، زنا بالجبر اور

طرح کے "جدید مہذب" جرائم کی رفتار بڑھتی جا رہی ہے جس پر وہاں کی مستند جرائم کی رپورٹیں شاہد ہیں۔ آج یورپ و امریکہ (جن پر ہم اپنی متاع دین و دانش قربان کر چکے ہیں) اپنے جرموں کو بند کرنے پر قادر نہ ہو سکے تو ایک نئی فرنگیانہ تکنیک استعمال کی۔ جیسے ان سے مغلوب ہو کر تے آئے کہ ہر جرم کو "جرائم" کی فہرست سے نکالنا شروع کر دیا یا گناہ کو بھی نیکی بنا دیا۔ امریکہ اور یورپ کے قوانین کی تاریخ پر نگاہ رکھنے والے ہمارے دعویٰ کی یقیناً تائید کریں گے کہ وہاں جب جرم پر قابو نہیں پایا جا سکتا تو اسے اولاً قانونی نرمی سے ہم کنار کر دیا جاتا ہے اور اس نرمی کے نتائج بد سے بدتر برآمد ہونے لگتے ہیں تو پھر اس گناہ کو ثواب بنا دیا جاتا ہے اور قانونی تحفظ دے دیا جاتا ہے۔ کلیسا بھی اس سلسلہ میں پہلے چلاتا ہے پھر وہ بھی اپنے آپ کو بے بس پا کر ہموار ہو جاتا ہے۔

بے بسی کے شواہد

اس ضمن میں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ابھی حال ہی میں برطانوی پالیمنٹ نے تلذذ بالمثل Homosexuality کے تحفظ کے لئے قانون بنا دیا ہے۔ حالانکہ وہ ایسا فعل ہے جس سے فطرت سلیمہ خود بخود ابا کرتی ہے اور عقل و دانش ان کے کرنے والوں پر لعنت بھیجتی ہے اور ماتم کرتی ہے۔ مگر "جمہوری تقاضا" کے تحت دنیا کی "مہذب ترین" اور "قدیم ترین پارلیمنٹ" اس کے جواز و تحسین کا پروانہ دے دیتی ہے۔ جس کی بناء پر کلیسا میں مرد کا مرد سے ناطہ کر دیا جاتا ہے۔ عورت و مرد کے لئے میلان جنس کی بناء پر تو شاید کوئی گنجائش بے دین دانشمندوں کے ہاں نکل آتی۔ لیکن تلذذ بالمثل کے لئے برباد شدہ سدوم والوں نے بھی جواز کا ایسا ماڈرن یا جدید طرز اختیار نہیں کیا ہوگا۔ جس سے وحشت و بربریت اور تہذیب و ترقی کی دائرے مل جاتے ہیں۔ یہ "انسانی قانونی اداروں" کی کرشمہ سازی ہے کہ وہ جب چاہیں اور جس بہیمیت و وحشت کو چاہیں، تہذیب و ترقی کی قانونی شکل دے دیں۔ کہیں نسل کشی، کہیں اسقاط حمل، کہیں ننگی زادگی کو قانونی جواز سے نواز دیں۔ برطانیہ کی دیکھا دیکھی کینیڈا نے بھی قانونی طور پر تلذذ بالمثل کو اپنا لیا ہے اور ڈنمارک تو ان دونوں سے آگے نکل گیا ہے جس کی پارلیمنٹ میں حال ہی میں بہن اور بھائی کی شادی کا مسودہ قانون پیش ہو کر زیر بحث آیا ہے۔ شہوات میں ڈوبی ہوئی نسل انسانی کی مجالس قانون ساز سے اور توقع ہی کیا کی جا سکتی ہے۔ اس لئے وہ قانون جس میں مجرم کے ساتھ ہمدردی اور قانونی رعایت برتی جائے گی وہاں نہ تو جرائم رک سکتے ہیں اور نہ صحیح عدل و انصاف ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے قانون کے اجراء میں مجرمین پر نرمی کو پسند نہیں کیا

اور صاف کہہ دیا کہ ''تم لوگوں کو ان دونوں (زنا کے مجرموں) پر اللہ کے احکام کے اجراء کے بارہ میں ذرا رحم نہ آنا چاہیے''۔ (النور۔۱)

اسلامی قانون کی خصوصیت

اسلام کا ''خدائی قانون'' جو فرد و معاشرہ دونوں کے حقوق کا واحد عادل و نگراں ہے گو فرد کی سود و بہبود اس کی نگاہ میں ہے۔ مگر وہ معاشرہ کو فرد پر قربان نہیں کرتا۔ اس کا نظریہ ہے کہ اگر بیک وقت ایک بھی ڈوب رہا ہو اور سو بھی ڈوب رہے ہوں تو سو کے بچانے میں اگر ایک ڈوب جائے تو کوئی حرج نہیں۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ ''مجرم'' کو اپنے جرائم میں ایسی رعایت دے دو کہ وہ پورے معاشرہ کو یہ کہتا ہوا لے ڈوبے:

ہم تو ڈوبے ہیں صنم۔ تم کو بھی لے ڈوبیں گے

وہی قومیں نجات و ترقی پاتی ہیں جو فرد کو ملت پر قربان کر دیتی ہیں۔ وہ قومیں کبھی نہیں پنپ سکتیں جو افراد و مخصوص طبقات کے مفادات کو قوم و ملت، معاشرہ و سوسائٹی کے عمومی مفاد پر ترجیح دیتی ہے۔ اس لئے اسلام نے اپنے نظریہ قانون میں اس بات کو پیش نظر رکھا ہے کہ مجرم کو ہمیشہ ایسی سزا دی جائے جس سے اس کے مادہ جرم کا استیصال ہو جائے اور یہ سزا ایسی عبرت انگیز ہو کہ دوسرے اسے دیکھ کر ہمیشہ کے لئے اس عمل سے رک جائیں اور سوسائٹی ہمیشہ کے لئے ایسے روگ اور ناسور سے پاک ہو جائے۔

قرآن کا نظریہ سزا

اسی لئے قرآن کریم نے ''جرائم کی سزائیں'' **جزاء بما کسبا نکالاً من اللہ (مائدہ)** سزا کے بدلے اس کے جو کمایا ان نے اور عبرت خدا کی طرف سے) کا نظریہ پیش کیا ہے۔ قرآن کریم کے ان الفاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے نظریہ سزا میں (۱) مکافات عمل (بدکرداریوں کا بدلہ) اور (۲) عبرت انگیزی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس سزا میں چونکہ مجرم اور معاشرہ دونوں کی بہبود پیش نظر ہے۔ اس لئے اگر مجرم کا جرم آشکارا ہو گیا ہے اور جماعت یا معاشرہ نے فرد کے اس برے فعل کو جان لیا ہے تو سزا بھی ایسی ہونی چاہیے جو بیک وقت مجرم کو آئندہ کے لئے اس جرم سے روک دے اور معاشرہ کے لئے بھی ایسی عبرت کا سامان مہیا کرے کہ اس معاشرہ کا کوئی بدفطرت فرد بھی ایسے قبیح فعل کے اقدام کی جرات نہ کر سکے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب مجرم کو قرار واقعی سزا دی جائے اور مجمع کے لئے اسے درس عبرت بنا دیا جائے۔ تا کہ وہ بزبان حال پکارتا پھرے:

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو

عبرت پذیری کے لئے ضروری ہے کہ چوری چھپے سزانہ ہو کہ اس سے عبرت پذیری کا مقصد فوت ہو جائے گا اور عدل وانصاف اور اصلاح معاشرہ کا حق ادا نہ ہو سکے گا۔ اس لئے ایک اور مقام پر زنا کی سزا کے متعلق صاف الفاظ میں حکم دیا گیا ہے کہ:

ویشھد عذا بھما طائفة من المومنین (النور)

اور دونوں کی سزا کے وقت مسلمانوں کی ایک جماعت کو حاضر رہنا چاہیے۔ اسلامی نظریہ کی خصوصیات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب اسلام کی سزاؤں پر نظر کیجئے۔

چور کی سزا

اسلام نے چور کی سزا ہاتھ کاٹنا مقرر کی ہے۔ جسے وحشیانہ سزا کہا جاتا ہے، کہ یہ چور پر ظلم ہے حالانکہ چوری خود ایک وحشیانہ عمل ہے۔ معاشرہ کے اس مجرم و وحشی کو اگر اس کی وحشت و بربریت سے روکنے اور معاشرہ کو اس کے شر سے بچانے کے لئے اگر اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے تو کیا حرج ہے۔ ایک ہاتھ کٹتا ہے صدہا ہاتھ کی کمائی محفوظ ہو جاتی ہے۔ ہزاروں کی تجوریاں بچتی ہیں۔ سعودی عرب میں جہاں آج سے پچاس سال پہلے لوٹ مار کے قصے مشہور تھے آج ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لاکھوں اور ہزاروں کا مال دوکان میں پڑا ہے۔ دوکاندار نماز کے لئے کعبۃ اللہ جاتا ہے۔ آدھ گھنٹہ وہاں گزار کر آتا ہے دریں اثناء دوکان کھلی ہے لیکن کوئی آنکھ اٹھا کر بھی اس کے مال کی طرف نہیں دیکھتا۔ نہ ایک تنکا چوری ہوتا ہے اور یہ سب اسی سزا کی برکت ہے کہ چند لوگوں کے شرع میں ہاتھ کٹ گئے۔ آج کوئی ہاتھ چوری کے لئے نہیں بڑھتا، اگر ایک ہاتھ کٹ جائے ہزاروں کو عبرت ہوگی۔ یہ خود مستقل سزا اور سامان عبرت ہے کہ ایک شخص کٹے ہوئے ہاتھ کے ساتھ پھر رہا ہے لیکن اس کا یہ مدعا نہیں کہ جہاں یہ عبرت پذیر عادلانہ سزائیں نافذ ہوتی ہیں۔ وہاں سب طرف ہاتھ کٹے ہوئے ہی پھر رہے ہوتے ہیں۔ چند کا ہاتھ کٹا اور ہمیشہ کے لئے اس فتنہ کا سد باب ہو گیا۔ کم از کم راقم نے ساڑھے تین ماہ قیام حجاز میں ایک ہاتھ کٹے شخص کو نہیں دیکھا، نہ کسی کا ہاتھ کٹتے دیکھا۔ سزا کا تصور ہی اتنا ہیبت ناک ہوتا ہے کہ کسی کو جرم کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ بقول سعدیؒ اگر ایک جگہ سے پانی پھوٹتا ہے تو اس کو سرمہ کی سلائی سے بند کر دو۔ ورنہ بعد میں ہاتھی بھی اسے بند نہیں کر سکے گا۔

آج معاشرہ ہماری نظر سے اوجھل ہے ورنہ جیسے ڈاکٹر کے مشورہ پر ایک (Septic Hand) زہر رسیدہ ہاتھ کو جسم کے بچانے کے لئے کاٹ دیتے ہیں اور اس میں قباحت نہیں

سمجھتے۔ اسی طرح سوسائٹی کو بچانے کے لئے چور کے ہاتھ پر ہم اعتراض نہ کرتے۔ جس طرح شفیق ترین ماں جو بچے کے ہاتھ میں کانٹا چبھنا گوارا نہیں کرتی اگر اس کے بیٹے کے ہاتھ میں پیپ پڑ جائے اور اسے ڈاکٹر کہے کہ بیٹے کا ہاتھ کٹوا دے۔ ورنہ تمام جسم یا پورا بازو خراب ہو جائے گا تو ماں اپنے تمام پیار و محبت کے باوجود ڈاکٹر کی نصیحت کو مانے گی اور بیٹے سے کہے گی کہ بیٹا ہاتھ کٹوا لے کہ تیرا باقی جسم بچ جائے۔ ہاتھ کٹتے وقت، بیٹے کا ہاتھ کٹ رہا ہوگا اور رحیم و مہربان ماں کا دل کٹ رہا ہوگا۔ لیکن عقل کے تقاضے کی بنا پر سب کچھ گوارا کرے گی کہ ہاتھ کٹتا ہے تو کٹ جائے لیکن میرے بچے کا باقی جسم بچ جائے۔ اسی طرح رحیم و شفیق اللہ تعالیٰ ہاتھ کاٹنا نہیں چاہتے لیکن معاشرہ کی جان یعنی اس کے اخلاق و اعلیٰ قدروں کو بچانے کے لئے اور اس کے حقوق اور مال و متاع کی حفاظت کے لئے فرد کا ہاتھ کٹوا دیتے ہیں کہ بسا اوقات چوری جان لیوا تک ثابت ہو جاتی ہے۔ ہم سادہ دل روتے ہیں اور اعتراض کرتے ہیں لیکن حکمت ربانی مسکراتی ہے اور کہتی ہے۔ ذرا سوچو تو سہی یہ سختی کتنوں پر نرمی کا سبب اور ہاتھ کا کٹنا کتنوں کی گردنوں کے بچاؤ کا ذریعہ بن گیا۔ یہ قہر خاص برائے لطف عام ہے اور یہ قطع ید برائے حفاظت جسم و جان ہے۔ اس لئے قطع ید کی سزا وحشیانہ نہیں۔ بلکہ حکیمانہ ہے۔

لمحہ فکریہ

زنا کی سزا کے متعلق کچھ کہنے سے پیشتر چند باتیں ذہن نشین کرانی اشد ضروری ہیں۔ کہ آج مغرب کی تقلید میں ہمیں اپنے قوانین کی قدر نہیں رہی اور ہم ان کی کہی کہہ رہے ہیں اور ان کی سنی سنا رہے ہیں۔ ہمارا ذہن اتنا مفلوج ہو گیا ہے کہ ہماری اپنی کوئی رائے باقی ہی نہیں رہی۔ جسے یورپ اچھا کہتا ہے، اسے ہم اچھا سمجھتے ہیں۔ جسے وہ برا قرار دیتا ہے، اسے ہم برا تسلیم کر لیتے ہیں۔ آج کسی مسئلہ پر بات کرنے سے پہلے ہمیں یہ سوچنا پڑتا ہے کہ مغرب کا اس بارے میں نظریہ کیا ہے۔ اگر وہاں سے سند جواز مل گئی تو پھر کسی تحقیق کی ضرورت نہیں اور اگر وہاں سے کسی بات کے غلط و ناجائز ہونے کا فتویٰ صادر ہو گیا تو ہماری زبانیں گنگ ہو گئیں۔ ہمارے دلوں پر تالے پڑ گئے اور ہمارے دماغوں کے سوتے خشک ہو گئے۔ "مرعوبیت" کی اس دنیا میں قلندرانہ جرات، مومنانہ فراست، فقیہانہ دانش و حکمت، داعیانہ بے باکی و ہمت کے بغیر ایک قدم بھی آگے بڑھانا مشکل ہے:

چیتے کا جگر چاہیے شاہین کا تجس
جی سکتے ہیں دنیا میں بے حکمت افرنگ

جس شخص یا قوم کے پاس قرآن جیسی کتاب اور سید الانبیاء فخر رسل حضرت محمد ﷺ جیسی ذات عالی مرتبت موجود ہو۔ اسے یورپ کا ''سحر سامری'' بچا نہیں سکتا اور وہ اپنے مسائل کے لئے عدل و حکمت سے تہی دامن غریب یورپ کی دریوزہ گری نہیں کرسکتا!

خیرہ نہ کر سکی مجھے دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

بہر حال اگر آپ یورپ کے عیارانہ استدلال اور ساحرانہ علم و فن سے یکسو ہو کر کسی مسئلہ پر سوچیں گے تو انشاء اللہ مسئلہ کا حل آسان ہو جائے گا۔

مغرب کے اعتراضات

اسلامی عائلی احکام پر اعتراضات مغرب اپنے ''خاص ذہن'' اور اپنی خاص تہذیب و تمدن کی فضا میں پروردہ ''عقل'' کی بناء پر کرتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یورپ کا اپنا ایک خاص مزاج و کلچر ہے۔ ایک خاص تہذیب و تمدن ہے۔ جس کا قوام یونانی اور رومن ثقافتی ورثہ اور علم الاصنام اور باربیرین اور قرون مظلمہ کی تہذیبوں اور بگڑی ہوئی عیسائیت سے بنا ہے۔ کیونکہ حقیقتاً بیچارہ یورپ خدائی دین عیسائیت سے کبھی بہرہ مند ہوا ہی نہیں۔ یورپ کو نام نہاد عیسائیت ''سینٹ پال'' کے ذریعہ پہنچی۔ جو اصلاً ''سال'' یا (سالوس) نامی یہودی تھا۔ جس نے عیسائیت کو بگاڑنے کے لئے عیسائیت کا جامہ پہنا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے دین کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ مقصد یہ ہے کہ یورپ کا تمدن اپنے اندر یونانی، رومن، باربیرین اور مسخ شدہ عیسائیت کے اجزاء لئے ہوئے ہے۔ بے حیائی و عریانی، یونانی و رومانی میراث ہے اور وحشت و ظلم باربیرین ازمنہ وسطیٰ کی نتیجہ ہیں۔ موجودہ عیسائیت میں تجرہ کمال کی بات ہے۔

تجرد کی زندگی

جرمنی میں راقم الحروف سے ایک شخص نے حضور نبی کریم ﷺ کی ازدواجی زندگی کے متعلق سوال کیا ضمناً تجرد کے عیسائی نظریہ کی فوقیت کو ثابت کرنا چاہا تو میں نے اسے کہا کہ اگر تمام دنیا عیسائی ہو جائے اور ساٹھ ستر سال تک مجرد رہے۔ تجرد کے قوانین و ضابطوں کی مکمل پابندی کرے اور گرجوں ''تہہ خانوں'' اور کلبوں کی زندگی کے پاس نہ جائے تو یقیناً ستر سال کے بعد نسل انسانی عیسائیت کے اس ''مسیحانہ اقدام'' نظریہ سے ختم ہو کر رہ جائے گی۔ انسانیت کے لئے تجرد کی زندگی نہ کمال ہے، نہ خوبی اور نہ حقیقتاً ممکن العمل ہے۔ اگر تاہل کے جذبات نہیں ہونگے، نکاح نہیں ہوگا اور فرائض ازدواجی کی ادائیگی نہ ہوگی تو لازماً نسل انسانی ختم ہو جائے گی اس لئے حکمت الٰہی نے نسل انسانی کے بقاء کے لئے جذبات کی دنیا آباد کی۔ نکاح کو جائز قرار دیا اور مرد و عورت کے فطرتی قویٰ اور طبعی جنسی ضروریات کو

دیکھتے ہوئے نکاح کے دائرہ کو مردوں کے لئے چار تک وسعت دے دی۔ تا کہ خواہشات کا ناجائز استعمال نہ ہو سکے۔ عورت فطرۃً بیک وقت ایک سے زیادہ خاوندوں کے حبالہ عقد میں نہیں آسکتی کہ میراث ونسل وغیرہ کے قانونی اور طبعی رقابت وغیرہ کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں اور خطرناک حد تک منتہی ہو سکتے ہیں۔

حدودالٰہی کی پابندی

جو اقوام عائلی معاملات میں حدودالٰہی کی پابندی نہیں کرتیں وہ انسانی فطرت ونفسیات سے کماحقہ واقف نہ ہونے کی بنا پر افراط وتفریط کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جیسا کہ آج کل مغرب کا حال ہے جو سراپا فسق نواز ہے، عفت نواز نہیں۔ جن لوگوں نے مغرب کی نفسیات جنس کی وہ کتابیں پڑھی ہیں جن میں جنسی تجارب کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ وہ اس بات کی سو فیصد تصدیق کریں گے کہ آج مغرب جنسی بے راہروی کے اس جہنم میں گر چکا ہے۔ جس کا تصور بھی اقوام ماقبل یا بیچارہ مشرق نہیں کر سکتا۔ اور جس سے اس کا عفت وپاکیزگی کی طرف لوٹنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ **ویحدث اللہ من بعد ذالك امرا** ۔ اور دراز نفسی کا مطلب یہ ہے کہ مغرب کا مجرم دل ودماغ اپنی فسق نوازی، بے حیائی اور فواحش پروری کی بنا پر اسلام کے پاکیزہ، عفت مآب اور حیا پرور، پاکدامن معاشرہ کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جس معاشرہ کی لغت میں ''حیاء'' نامی لفظ کا عملاً کوئی وجود ہی نہ ہو۔ ''عفت'' کا نشان تک تلاش بسیار کے باوجود نہ مل سکے اور (Virgin Mery) کی نام نہاد نام لیوائیں اپنی بکارت کے شیشوں کو بلوغ سے پہلے ہی جنسی تجارب میں توڑ چکی ہوں۔ (Gesus Crist) کے تجرد کا کلمہ پڑھنے والے تجرد کے دائروں کو بچپن میں ہی پھاند چکے ہوں وہ کیا جانیں کہ اسلام کا نظام عفت وحیاء کیا ہے۔ اور کسی کے ازدواجی بندھنوں کے بغیر کسی کے دامن عفت کو تار تار کرنا کتنا کریہہ، گھناؤنا اور وحشیانہ فعل ہے۔

غور کیجئے اگر کوئی شخص شادی اور ازدواج کے قانونی دائرہ کے اندر نہیں رہتا اور حدوداللہ کو توڑ کر کسی غیر عورت سے متعلق ہو جاتا ہے اور اسے حمل ٹھہر جاتا ہے تو کیا اس کا یہ فعل اخلاقاً، قانوناً، عقلاً درست ہو گا؟ یہ بات ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص کی زمین ہے۔ جس کا کوئی دوسرا شخص قانوناً مالک نہیں اور نہ کسی اخلاقی ضابطہ سے اس کا اس زمین میں کوئی حق ہے۔ اگر یہ شخص پہلے شخص کی زمین میں ہل چلاتا ہے۔ بیج ڈالتا ہے فصل پیدا ہو جاتی ہے۔ تو کیا اس فصل پر اس شخص کا جو دوسرے کی زمین کو استعمال کرتا ہے۔ قانوناً کوئی حق ہے، یہ فصل اس کی نہیں ہو گی۔ اس نے تو اپنے بیج کو ہی ضائع کر دیا۔ فصل زمین والے کی ہو گی اور اسے بیج کے ضائع کرنے کی سزا دی جائے گی۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''بیٹا اس کا ہو گا جس کی منکوحہ کے گھر پیدا ہو گا اور زانی کو اس جرم پر سنگسار کیا جائے گا''۔

ایمی سے آمنہ تک

(قبول اسلام کی ایک ولولہ انگیز کہانی)

راشدہ قریشی

ڈاکٹر اکبر ایس احمد واشنگٹن ڈی سی امریکن یونیورسٹی میں اسلامی معلومات کی ترسیل کا فریضہ انجام دے رہے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ نائن الیون کے بعد پوری دنیا میں مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دینے کا ایک خطرناک پروپیگنڈا کیا گیا۔ اکثر امریکی پالیسیوں سے یہ ظاہر ہوتا رہا ہے کہ بش انتظامیہ نے مسلمانوں کے خلاف نفرت پھیلانے کے لئے زہر افشانی کی کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن دلچسپ اور توجہ طلب امر یہ ہے کہ جب کسی نے ابھرنا ہوتا ہے تو اسی کو دبایا جاتا ہے...

قدرت نے بحر تلاطم کے تھپیڑوں سے سیپ کے موتی کو چمکانا ہوتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔ نائن الیون 2001ء کے بعد دنیا ان محرکات سے بھی پہلوتہی نہ کر سکی جو اسلام کی بلندی و دیگر مذاہب میں اسلام کی انفرادی جاہ و حشمت کا باعث بن گئے۔ خصوصاً خود عیسائی قوم نے اسلام کا تعارف حاصل کیا۔..... اسلام یورپ و امریکہ میں پھیلنے لگا.... لیکن اسی نائن الیون کو امریکہ کی عوام سے لیکر انتظامیہ تک بوکھلا اٹھی تھی۔ بش کی اوسان خطا ہوگئے تھے۔ پومپولر سسٹم کی واحد سپر پاور امریکہ کی ایجنسیاں ناکام ہوگئی تھیں۔ "وائٹ ہاؤس خطرے کی زد میں ہے" کے خوف سے صدر بش کو وائٹ ہاؤس چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔ بہرحال بے شمار امریکی مسلمان دانشوروں کا خیال ہے کہ پینٹا گون اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے دھماکوں میں لاکھوں کی ہلاکتوں کے بعد ہم یہ سمجھنے لگے تھے کہ یہ مسلمان ہے جو دہشت گردی کر رہا ہے.... لیکن نہیں ایسا نہیں تھا.... بلکہ امریکی عوام بھی ایسا نہیں سمجھتی ان کے لبوں پہ سوال ہے Why Muslims would terrorise the world ملکی و غیر ملکی انتظامیہ کی طرف سے بنائی گئی مسلمان دشمن پالیسیوں کے سبب جبکہ محض شک کی بنیاد پہ مسلمان اب تک لاکھوں کی تعداد میں ہر جگہ بلکہ اپنے ہی اسلامی ملکوں میں بھی ہراساں و دہشت زدہ ہوگئے تھے۔ جہاں تک "اسلام" کا تعلق ہے تو کئی مسلمان سکالرز جو امریکہ میں مقیم ہیں، کے مطابق نائن الیون کے بعد امریکہ میں مذہبی بغاوت عروج پہ آ گئی ہے۔ یہی ایک نکتہ پیش نظر رکھتے ہوئے پروفیسر اکبر یونس احمد 6 مارچ 2004ء کو ایک مقامی انگریزی روزنامے میں سوال کرتے ہیں اور وہ بجا طور پہ سوچتے ہیں کہ اگر نائن الیون کے بعد مسلمان بدنام ہوا اور امریکہ و یورپ میں اسلام کے خلاف منفی رجحان پھیلا تو گنزاگا (Ganzaga) یونیورسٹی

واشنگٹن ڈی سی کی نوجوان باشعور طالبہ نے اسلام قبول کرنے کا اتنا بڑا اقدم کیوں اٹھایا....ایمی (Amy) جو کہ ایک عیسائی خاندان میں پلی بڑھی، پیدائشی عیسائی تھی۔ وہ مسلمان کیسے ہوئی؟ پروفیسر اکبر نے نومسلم ایمی (Amy) کی قبول اسلام کی ذاتی کہانی کا اپنے ایک انگریزی روزنامے کے کالم میں نہایت خوبصورت انداز میں ذکر کیا۔ اس کالم میں پروفیسر اکبر نے آمنہ کے قبول اسلام کے اقدام پہ قلم آزمائی کرتے وقت جن حالات کا جائزہ لیا وہ تین باتوں میں اہم ہے۔

(i) ایمی نے آمنہ تک کا سفر کیوں کیا (Personality Affect)؟

(ii) وہ حالات کیا تھے جن کے زیر اثر آمنہ نے اسلام قبول کیا یعنی (Circumstances)؟

(iii) وہ مسائل کہ مسلمان ہونے کے بعد آمنہ کو سامنا کرنا تھا یعنی (Challenges)

ایمی (Amy) جو کہ اب مسلمان ہوکر آمنہ کہلاتی ہے۔ جو بیس سال کی باشعور لڑکی ہے۔ امریکہ کینوک واش (Kennewick Wash) میں پیدا ہوئی۔ 1998ء میں اس نے (Ganzaga) یونیورسٹی واشنگٹن ڈی سی میں داخلہ لیا وہ اس یونیورسٹی میں مشرق وسطیٰ کی پولیٹکس میں ماسٹر پروگرام کے لئے داخل ہوئی تھی.... یہاں اس نے اپنے ماسٹر پروگرام کے دوران محسوس کیا کہ وہ روحانیت کی طرف مائل ہے اور وہ خود کو نیچر سے متاثر پاتی ہے۔ دراصل اس کی ذات کا یہ روحانی میلان ہی اسکا اسلامی تعلیمات میں دلچسپی لینے کا محرک تھا اور بالآخر یہی میلان 2003ء میں مسلمان ہونے کے بعد اسکی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب لے آیا۔ نائن الیون کے بعد اسکا مسلمان ہوجانا ہی امریکی نقطہ نظر جو پھیلانے کی کوشش کی گئی کہ اسلام دہشت گردوں کا مذہب ہے، کی نفی کرتا ہے۔ ایمی کا آمنہ ہوجانا درحقیقت اسلام کی عظمت وحقانیت کی دلیل ہے۔

آمنہ اس وقت اپنے رب ذوالجلال کی شکرگزار ہے جس نے اس پر کرم کیا۔ اسے راہ حق کی ہدایت عنایت فرمائی اور وہ ایک بہترین کمیونٹی "مسلم امہ" کا حصہ بن گئی۔ ایک ایسی کمیونٹی جسے اپنے رب بزرگ وبرتر سے اپنے عقائد کے اعتبار سے بہترین قاعدہ اخلاق، مکمل ضابطہ حیات عطا کیا گیا ہے۔ آمنہ (Amy) کے مطابق اسلام کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کی وہ اپنے کالج کے جونیئر سیکشن ہی سے مشتاق ہوگئی تھی۔ وہ کہتی ہے کہ نہیں... میں نے اب محسوس کیا

کہ میں نے تو ایک ایلیمنٹری سطح پہ ہی اسلام میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ
مجھے یاد ہے کہ میں اپنے ایک لندن کے ٹرپ کے چھ ماہ بعد گھر آئی تو میرے اندر ایک بے چینی سی
تھی یہ 2001ء کی بات ہے جب پینٹا گون اور ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ
اسلام کیا ہے مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ جاننا ہے چنانچہ میری تشنگی مجھے انٹرنیٹ پہ لے گئی
اور میں اسلامی تعلیمات کی سائنس تلاش کرنے لگی۔ اگلے سال انٹرنیٹ سے مجھے قرآن حکیم کا
انگریزی ترجمہ پڑھنے کو ملا تو اسے پڑھ کر سمجھ کر میری زندگی میں ایک انقلاب سا برپا ہو گیا۔ میں
جب بھی اسے پڑھتی کھوسی جاتی۔ اتنا خوبصورت کلام پہلے کبھی نہ سنا تھا۔ یہ قرآن اب بھی میرے
پاس محفوظ ہے۔ اس وقت مجھے 11 ستمبر کے حوالے سے اسلام و مسلمانوں کے خلاف بے شمار منفی
باتیں مل رہی تھیں۔ مختلف کوارٹرز اور میڈیا سے مجھے اسلام و مسلمانوں کے حوالے سے بڑی عجیب
باتیں سننے کو ملتیں۔ جس سے اسلام میں میری دلچسپی مزید بڑھی۔ مئی 2002ء کو میں جب
گریجوایشن سے فارغ ہوئی تو میں نے اپنی تمام تر معمول کی سرگرمیاں و دلچسپیاں ترک کر دیں
اور زیادہ وقت اسلام کو سمجھنے میں گزارا لیکن پھر ایسا ہوا کہ میں نے اسلام کے بارے میں سوچنا
چھوڑ دیا نہ انٹرنیٹ کی اسلامک سائنس کو کھولا نہ قرآن پڑھا اور خود کو ٹٹولا کہ کیا میں واقعی اسلام
سے متاثر ہو گئی ہوں یا اسلام کو ایک سبجیکٹ کے طور پر پڑھ رہی ہوں۔ میں نے سوچا کہ میں اب
کسی اور مذہب کا مطالعہ کرتی ہوں یا پھر کسی اور سبجیکٹ کو پڑھتی ہوں۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی
اور سبجیکٹ میری دلچسپی کا مرکز نہیں بن پا رہا۔ میں جتنا اسلام کے موضوع سے آنکھیں چراتی یہ
میرے شعور میں موجود رہتا۔ میں سچ مچ اسلامی تعلیمات اور اسکی پیش کردہ سماجی زندگی سے بے
حد متاثر ہو چکی تھی۔ میں اسلام سے اسقدر متاثر ہوئی کہ آہستہ آہستہ یہ میرے یقین
(Beleive) کی پختگی میں شامل ہو گیا جب میں نے محسوس کیا کہ یہ مذہب تو اب ساری زندگی
مجھ پر اثر رکھے گا۔ اس طرح اسلام کی حقانیت میرا ایمان (Faith) بن گیا۔ کیا میں مسلمان
تھی۔ ہاں میں لاشعوری طور پر مسلمان بن گئی تھی پھر یہ ہوا کہ میں نے شعوری طور پر اسلام قبول کر
لیا۔ میں مسلم امہ کی رکن بن گئی۔ میں جانتی تھی کہ یوں میرا اسلام قبول کرنے کا دانستہ و واضح فیصلہ
میرے ارد گرد کے لوگوں اور میرے خاندان والوں کے لئے باعث صدمہ ہوگا۔ لیکن میں ان تمام
چیلنجوں کا سامنا کرنے کو تیار ہو گئی جنکا مجھے مسلمان ہونے کے بعد سامنا کرنا تھا۔ ایک وقت ایسا
آیا کہ پھر میں نے سوچا میں اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دوں۔ لیکن مجھے اپنے اہل خانہ و رشتہ

داروں کو قائل کرنا بہت دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ میں عجیب قسم کے ذہنی دباؤ کا شکار رہتی۔ پھر میں نے خود ہی سوچا کہ میں اپنے فیصلے کو اپنی فیملی پہ ظاہر کرنے میں کیوں عجلت سے کام لوں چنانچہ مجھے اس چیلنج کا سامنا کرنے کے لئے کچھ وقت درکار تھا۔ میں نے تین ہفتے بعد اپنی فیملی کو اپنے مسلمان ہوئے سے آگاہ کر دیا۔ وہاں مجھے ہر کوئی عجیب نظروں سے دیکھتا اور ملتا محسوس ہوا..... لیکن میں اللہ کی طرف اپنا دھیان لگا چکی تھی۔ مجھے چھپ کر نمازیں پڑھنا پڑتیں، میں چھپ کر قرآن کا مطالعہ کرتی۔ پھر میں نے اپنے انکل اور ایک کزن سے اپنے مذہب کی تبدیلی کی بات کی۔ میرے انکل اور کزن مجھے حیران کن نظروں سے دیکھتے رہے کیونکہ انہیں اسلام کے بارے میں اور اسلام کی عظیم تعلیمات بتاتے بتاتے میں جذباتی ہوگئی تھی۔ میرا دل پھٹنے لگا تھا یہاں تک کہ ان سے گفتگو کرتے ہوئے میں زار و قطار رونے لگی میں نے انہیں بتایا کہ اسلام جسے میں نے اپنا مذہب بنالیا ہے وہ ایک بہترین زندگی گزارنے کا راستہ بتاتا ہے۔ اس میں پاکیزگی، محبت، امن، احترام آدمیت ہے۔ شاید میری دیوانگی دیکھتے ہوئے میرے انکل اور کزن نے مجھے Ok کر دیا۔ لیکن جب میں نے اپنے مسلمان ہونے کا تذکرہ اپنی چھوٹی بہن سے کیا تو پہلے تو وہ کچھ الجھی الجھی سی رہی لیکن، کچھ دیر کے بعد مجھ سے چھوٹے چھوٹے سوال کرنے لگی۔ وہ شاید یہ سمجھنے لگی تھی کہ وہ اپنی ایمی بہن کو کھو دے گی لیکن میں نے اسے سمجھایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ میری چھوٹی بہن نے پوچھا کہ کیا تمہارے مسلمان ہونے کے بعد بھی میں تمہاری بہن رہونگی۔ میں نے اسے بتایا کہ اسلام میں ماں باپ، میاں بیوی، بہن بھائی بلکہ رشتہ داروں کا بڑا واضح تصور موجود ہے۔ اسلام خاندانی اکائی کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میرے خاندان کے افراد کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں میرا اسلام مجھے میرے اہل خانہ سے جدا نہیں کرتا۔ پھر ایک دن میں نے اپنی والدہ کو اپنے مذہب کی تبدیلی کے بارے میں بتایا اور میں آہستہ آہستہ سسکیاں لے رہی تھی مجھے ڈر تھا کہ کہیں مجھے مذہب جسے میں قبول کر چکی ہوں چھوڑ دینے کی ترغیب نہ دی جائے لیکن میری والدہ نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ انہوں نے کہا کہ تم نے جس چیز کو مناسب سمجھا وہی کیا۔ تمہیں ایسا کرنے کا حق ہے اور پھر میری والدہ نے میری گرینڈ ماں کو میرے مسلمان ہونے کے بارے میں بتایا۔ میری گرینڈ ماں کو بہت برا لگا اور وہ سخت صدمے میں آ گئی۔ گو کہ میرے خاندان کے چند افراد نے میرے مذہب کی تبدیلی پر میری حوصلہ شکنی نہیں کی لیکن وہ یہی سمجھتے رہے کہ میں کچھ عرصے کے لئے شوقیہ مسلمان ہوگئی ہوں اور یہ کہ میں بہت جلد

ٹھیک ہو جاؤں گی۔ لیکن میں اپنی فیملی کو اکثر یہ بات واضح طور پر بتا دیتی کہ مذہب کے بارے میں میں اب بھی نہیں بدلوں گی۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں اسلام قبول کر کے اس سے پھر جاؤں۔ آمنہ کہتی ہے کہ ممکن ہے کہ اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہنے اور میری عبادتوں کو دیکھتے ہوئے ایک دن میرے خاندان والوں کو میری سنجیدگی کا احساس ہو جائے۔

آمنہ بتاتی ہے کہ ایک مسلمان لڑکی ہونے کے ناطے میں نے حجاب اوڑھا.... میری چادر نے جب میرے تمام وجود کو ڈھانپ لیا تو بہت اچھا لگا۔ میں اس وقت بہت مقدس لگ رہی تھی۔ مجھے (Suburban Virgine) کی مسجد جانا تھا۔ وہاں کے لوگ مجھے بڑے پیار سے ملے۔ سب ایک جماعت کی صورت میں بیٹھے تھے۔ مجھے بہت سے لوگوں نے اسلام علیکم کہا انہوں نے اس طرح مجھ کو اسلام علیکم کہا کہ مجھے ایسا لگا کہ وہ مجھے بہت پرانا جانتے ہیں۔ ہمارے چرچ میں تو ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں کوئی کسی کا نوٹس نہیں لیتا۔ نماز کے بعد مسجد کے لوگ ایک دوسرے کو پیار سے گلے لگاتے ہیں جس سے ان کی ایک دوسرے سے محبت کے موجود ہونے کا احساس ہوتا۔ میں (Sububan Virgine) کی مسجد میں محسوس کر رہی تھی کہ میں ایک سپیشل کمیونٹی کا حصہ بن چکی ہوں۔

پروفیسر اکبر کہتے ہیں کہ آمنہ اپنی نئی کمیونٹی ''مسلم امہ'' کے عالمی مسائل سے بھی واقف ہے۔ آمنہ کہتی ہے کہ جب سے میں نے اسلام قبول کیا ہے بہت سے لوگوں نے مجھ سے پوچھا ہے کہ امریکہ میں مسلمانوں کا کیا مستقبل ہے خصوصاً 11 ستمبر کے واقعہ کے بعد امریکہ میں مسلمانوں کی کیا حیثیت ہے....؟ میں سمجھتی ہوں کہ مسلمان خواہ امریکہ میں ہے یورپ میں، مشرق وسطیٰ میں یا جنوب ایشیا، میں اپنے تشخص کا تحفظ وہ خود کریں۔ ویسے آمنہ سمجھتی ہے کہ اس وقت پوری دنیا ئیں مسلمانوں کا ایک ہی مسئلہ ہے وہ مسئلہ نہ امریکہ کا ہے، نہ مسلمان کے خلاف غیر طاقت کا پروپیگنڈا بلکہ یہ تو عالم اسلام کے مسلمانوں میں باہمی اتحاد کے فقدان کا مسئلہ ہے.. مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے ہی بھائیوں کے خلاف صف آراء نہ ہوں کہیں بھی مسلمان کے خلاف ظلم وستم ہو رہا ہے تو منظم ہو کر باہمی ربط واتفاق سے ایک سیسہ پلائی دیوار کی مانند اپنے پہ ہونے والے ظلم وزیادتی کے خلاف آواز حق بلند کریں۔ آمنہ نے کہا کہ گو کہ میں نو مسلم ہوں لیکن میں اس بات پہ بھی پریشان ہو جاتی ہوں کہ آخر مسلمان اپنے چھوٹے چھوٹے تضادات پس پشت ڈال کر اسلام کے عظیم اصولوں کے مطابق اپنی ریاستی وذاتی زندگی کیوں نہیں گزارتے.....؟ بشکریہ نوائے وقت

اختلافی مسائل اور ان کا نقطہ عدل

صدرالدین اصلاحی

اب ہم موجودہ مسائل مہمہ میں سے تیسرے مسئلہ پر جو قرآن وسنت کے تتبع سے متعلق ہے بحث کرنی چاہتے ہیں۔

احکام شرعیہ کی معرفت حاصل کرنے کے لئے کتاب وسنت کا جو تتبع کیا جاتا ہے اس کے مختلف مدارج ہیں۔ سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ انسان کو بالفعل احکام شرعیہ کی معرفت پر اتنا عبور ہو جائے کہ وہ مستفتیوں کے اکثر سوالوں کا جواب بآسانی دے سکے، اور انسانی زندگی میں پیش آنے والے تمام واقعات کا شرعی حل معلوم کرنے میں اسے توقف اور خاموشی سے بہت کم کام لینا پڑے، یہی مقام اجتہاد ہے۔ اس استعداد اور قابلیت کے حصول کے چند طریقے ہیں:

ا۔ کبھی یہ استعداد احادیث میں غائر تفکر اور شاذ وغریب روایتوں کے تتبع سے حاصل ہوتی ہے، جیسا کہ امام احمد بن حنبلؒ کا خیال ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ ملکہ کے حاصل کرنے کے لئے بس یہی تفکر اور تتبع کافی ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسان کے لئے ضروری ہے کہ ایک ماہر لغت و ادب کی طرح مواقع کلام اور اسالیب بیان سے پوری واقفیت رکھتا ہو اور ایک وسیع النظر عالم کی طرح یہ بھی جانتا ہو کہ آئمہ سلف متعارض نصوص میں جمع وتطبیق کی صورت کس طرح پیدا کرتے تھے اور ان کے استدلال کا طریقہ کیا ہوا کرتا تھا۔

۲۔ کبھی یہ قابلیت اصول تخریج کو پوری طرح ضبط کرنے سے حاصل ہوتی ہے لیکن اس کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انسان کسی امام کے اصول کو سامنے رکھ کر استنباط مسائل کا طریقہ جان جائے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ احادیث اور آثار کے ایک معتد بہ حصہ پر اس کی نظر ہو، تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ کہیں اس کا قول اجماع سے ٹکرا تو نہیں رہا ہے۔ یہ طریقہ اہل تخریج کا ہے۔

۳۔ تیسرا راستہ جو مذکورہ بالا دونوں راستوں کی بہ نسبت اعتدال کا راستہ کہا جاتا ہے یہ ہے کہ ایک طرف آدمی قرآن وسنت سے اتنی آگاہی رکھتا ہو کہ فقہ کے اصولی اور اجمالی مسائل اور ان کے تفصیلی دلائل کا علم اسے بآسانی حاصل ہو سکے۔ دوسری طرف بعض اجتہادی مسائل پر کامل دسترس رکھتا ہو ان کے تمام گوشوں پر اس کی نگاہ ہو، ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دے سکتا ہو

وں کے طریقہ تخریج پر نقد اور کھرے کھوٹے کی تمیز کر سکتا ہو، خواہ اس کے اندر وسعت نظر اور
رے دو شرائط اور لوازم نہ پائے جائیں جو ایک مجتہد مطلق کے لئے ضروری ہوا کرتے ہیں۔
س مقام پر پہنچ کر اس کے لئے جائز ہے کہ مختلف رایوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھے، اور وہ مختلف
ہبوں کے دلائل سے واقف ہو کر کچھ باتیں ایک مذہب کی اور کچھ دوسرے مذہب کی لے لے
یعنی تلفیق کرے) اور بعض ایسی تخریجات کو ترک کر دے جو اگر چہ متقدمین کے نزدیک قابل
قبول رہی ہوں، لیکن وہ اپنی تنقید اور تحقیق کی روشنی میں انہیں غلط پائے۔ اسی وجہ سے تم دیکھتے ہو
کہ جن علماء کو مجتہد مطلق ہونے کا دعویٰ نہ تھا، وہ اپنی فقہی تصانیف میں خود مسائل کی تخریج کرتے
ہیں اور اکابر سلف کی آراء میں موازنہ کر کے ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب
جتہاد اور تخریج دونوں قابل تجزیہ و تقسیم ہیں، اور کسی جزئی مسئلہ میں اجتہاد کرنے کے لئے آدمی کا
مجتہد مطلق ہونا شرط لازم نہیں ہے تو پھر مسائل کی تحقیق میں اس طریقہ کا اختیار کرنا لوگوں کی نگاہ
میں کیوں مستبعد اور نا قابل قبول دکھائی دیتا ہے؟ تحقیق کا مقصود تو محض ظن غالب کے حصول تک
ہے اور اسی پر تکلیف کا دارومدار ہے۔

رہ گئے وہ لوگ جو اتنی گہری نظر نہیں رکھتے اور جنہیں اللہ نے اتنی فہم و بصیرت عطا نہیں کی ہے
کہ قرآن و سنت پر غور کر کے بطور خود مسائل کی چھان بین کر سکیں۔ انہیں چاہیے کہ اپنی زندگی کے
عام معاملات میں مذاہب مروجہ کے ان طریقوں اور فیصلوں کو اپنا مذہب سمجھیں جنہیں انہوں نے
اپنے آباؤ اجداد کے سلسلے سے اخذ کیا ہے لیکن جو واقعات معمولی نہ ہوں بلکہ اہم اور نادر الوجود
ہوں ان میں اپنے کسی قریب کے مفتی کا اتباع کریں اور قضایا میں قاضی کے حکم کی تعمیل کریں۔
یہی ان کے لئے سب سے مصئون راہ ہے۔

اسی خیال پر ہم نے ہر مذہب کے قدیم اور جدید علماء محققین کو پایا ہے اور تمام آئمہ مذاہب
نے اپنے پیروؤں کو اسی کی وصیت بھی کی ہے۔ "الیواقیت والجواہر" میں ہے:

"ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص میری دلیل سے واقف نہ ہو اسے میرے قول پر فتویٰ
دینے کا کوئی حق نہیں۔ خود امام موصوف جب کوئی فتویٰ دیا کرتے تو کہتے یہ نعمان ابن ثابت کی
(یعنی میری) رائے ہے جسے ہم نے اپنی علم و فہم میں بہتر سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ اگر کوئی اس سے بہتر
اور احسن رائے پیش کرے تو پھر ہماری رائے کے مقابلہ میں اس کی رائے صائب اور حق سے

زیادہ قریب ہوگی''۔

''امام مالک کہا کرتے تھے کہ ہر شخص کے اقوال دو قسم کے ہوتے ہیں کچھ لے لینے کے قابل اور کچھ رد کر دینے کے قابل۔ صرف ایک ذات اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کی ذات معصوم ہے''۔

''حاکم اور بیہقی نے امام شافعیؒ سے روایت کی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے جب کوئی حدیث پایہ صحت کو پہنچ جائے تو اسی کو میرا مذہب سمجھو۔ ایک دوسری روایت میں امام صاحب کا یہ قول منقول ہے کہ جب تم یہ دیکھو کہ میرا قول حدیث نبوی کی مخالفت کر رہا ہے تو احادیث پر عمل کرو اور میرا قول دیوار پر دے مارو۔ ایک روز امام مزنیؒ سے آپ نے فرمایا کہ ابراہیم میری ہر بات کی کورانہ تقلید نہ کرو بلکہ بذات خود اس میں غور کر لیا کرو کیونکہ یہ دین کا معاملہ ہے''۔

''امام احمد بن حنبلؒ کا قول ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کے مقابلہ میں کسی کی رائے کو کوئی وقعت حاصل نہیں۔ تم نہ میری تقلید کرو اور نہ کسی اور امام کی جس طرح انہوں نے کتاب وسنت سے احکام دین کی معرفت حاصل کی تم بھی حاصل کرو۔ کسی شخص کو فتویٰ دینے کا استحقاق نہیں تاوقتیکہ وہ تمام ائمہ کے مذاہب اور اقوال سے پوری طرح واقف نہ ہو۔ اگر اس سے کوئی ایسا مسئلہ پوچھا گیا جس کے متعلق اسے معلوم ہے کہ اس میں وہ تمام ائمہ جن کی عموماً پیروی کی جاتی ہے، متفق ہیں تو وہ یوں کہہ سکتا ہے کہ یہ جائز ہے اور وہ ناجائز ہے، کیونکہ ایسی صورت میں اس کا اپنا قول اور فتویٰ نہ ہوگا بلکہ ائمہ مجتہدین کے قول کی ترجمانی ہوگی۔ لیکن اگر مسئلہ ایسا ہے جس میں علماء کی رائیں مختلف ہیں تو وہ اس کے جواب میں یہ تو کہہ سکتا ہے کہ فلاں امام کے نزدیک یہ جائز ہے اور فلاں کے نزدیک ناجائز مگر اسے یہ حق نہیں ہے کہ بقیہ اقوال کو چھوڑ کر کسی ایک رائے کو اختیار کر کے فتویٰ دے دے، الا آنکہ اس رائے اور مذہب کے دلائل سے بخوبی باخبر ہو''۔

''امام ابو یوسفؒ اور زفرؒ وغیرہ سے منقول ہے کہ جب تک کوئی شخص یہ معلوم نہ کر لے کہ ہم نے یہ رائے کہاں سے اخذ کی ہے اس وقت تک وہ ہمارے اقوال پر فتویٰ دینے کا مجاز نہیں''۔

''عصام ابن یوسفؒ سے جب کہا گیا کہ آپ امام ابو حنیفہؒ کی رایوں سے اکثر اختلاف کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کی وجہ کھلی ہوئی ہے۔ انہیں جو فہم اور دقت نظر حاصل تھی وہ ہمیں حاصل نہیں، وہ ڈوب کر جن گہرائیوں سے حقائق نکال لاتے ہیں وہاں تک ہماری کمزور نگاہوں کی

رسائی نہیں ہو سکتی اور ہمارے لئے جائز نہیں کہ بغیر سمجھے بوجھے ان کے اقوال پر فتویٰ دیں''۔

''ابو بکر الاسکاف البلخی سے پوچھا گیا کہ ''کیا ایسے شخص کے لئے جو اپنے شہر کا سب سے بڑا عالم ہو، جائز ہے کہ فتویٰ دینے سے رکا رہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر وہ عالم درجہ اجتہاد رکھتا ہو تو جائز نہیں۔ لوگوں نے کہا کہ درجہ اجتہاد کب حاصل ہوتا ہے؟ جواب دیا کہ جب ایک شخص مسائل کے تمام پہلوؤں پر نگاہ رکھتا ہو اور معترضین کو معقول اور تسلی بخش دلیلوں سے خاموش کر سکے تو وہ مجتہد ہے''۔

ابن الصلاح کا قول ہے کہ ''اگر کوئی شافعی ایسی حدیث پائے جو اس کے مذہب کے خلاف ہو تو اسے اپنے علم اور تفقہ کا جائزہ لینا چاہیے اگر وہ اپنے اندر اجتہاد مطلق کی یا خاص اسی ایک مسئلہ میں اجتہاد کرنے کی پوری استعداد پائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ غور کرنے کے بعد اس حدیث پر عمل کرے اور تقلید کا خیال ترک کر دے۔ لیکن اگر وہ اپنے کو اس مقام سے فروتر محسوس کر رہا ہے اور اجتہاد کی طاقت سے بے بہرہ ہے مگر غور و فکر کرنے کے بعد کوئی معقول دلیل نہ پانے کی وجہ سے حدیث کی مخالفت بھی اس پر شاق گزر رہی ہے تو بھی حدیث ہی کا اتباع کرنا چاہیے بشرطیکہ امام شافعیؒ کے بجائے کسی اور امام نے اس پر عمل کیا ہو، کیونکہ اس صورت میں دوسرے امام کا اتباع امام شافعیؒ کے اتباع کا قائم مقام ہو جائے گا'' یہ ابن الصلاح کی رائے ہے اور امام نوویؒ نے بھی اسی کو مستحسن اور مختار قرار دیا ہے۔

چوتھا مسئلہ جسے ہماری جاہلانہ اور متعصبانہ ذہنیتوں نے اختلاف اور شقاق کی رزمگاہ بنا لیا ہے۔ وہ فقہاء کا باہمی اختلاف ہے۔ حالانکہ ان اختلافات میں سے اکثر، خصوصاً جن میں صحابہؓ بھی مختلف تھے اور دونوں طرح کی رائیں ان سے منقول ہیں مثلاً تشریق اور عیدین کی تکبیروں کا اختلاف، نکاح محرم (حج کے لئے احرام باندھ لینے والے) کے جواز کا اختلاف، ابن عباسؓ کے تشہد اور ابن مسعودؓ کے تشہد کا اختلاف، بسم اللہ اور آمین کو آہستہ یا بلند آواز سے کہنے کا اختلاف وغیرہ فی نفسہ آپس میں نہ کوئی اساسی تباین رکھتے ہیں اور نہ ان کی اصل مشروعیت میں آئمہ سلف کا کوئی اختلاف ہے، بلکہ اختلاف جو کچھ ہے وہ محض ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے میں ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ یہ تمام مذاہب کتاب و سنت سے مستنبط ہیں لیکن چونکہ ہر شخص کی نظر تحقیق اور قوت اجتہاد جداگانہ ہوا کرتی ہے۔ اس وجہ سے جو مذہب دوسرے کے نزدیک مرجوع تھا اسکے نزدیک

راجح اور اولیٰ ثابت ہوا اور اس نے اسے اختیار کر لیا۔ مثال کے طور پر قرات کو لو اور دیکھو کہ قرا
ایک ہی لفظ اور آیت کی قرات میں کس قدر مختلف ہیں۔ یہی حال علمائے فقہ کے اختلاف کا ہے
چنانچہ وہ اکثر اپنے اختلاف کی تعلیل بھی یہی کرتے ہیں کہ صحابہ کرام کی یہ رائے بھی تھی اور وہ بھی،
یعنی وہ بھی آپس میں اختلاف رائے رکھتے تھے۔ حالانکہ وہ سب کے سب ہدایت کی روشن شاہراہ
پر تھے۔ کون ہے جوان کے کسی فرد پر کجروی اور سنت نبوی کی مخالفت کا الزام عائد کر سکتا ہے؟ یہی
وجہ ہے کہ علمائے حق مسائل اجتہادیہ میں تمام ارباب افتاء کے فتووں کو جائز سمجھتے اور قضاۃ کے
فیصلوں کو تسلیم کرتے آئے ہیں اور بسا اوقات اپنے مذہب کے خلاف بھی عمل کرتے رہے ہیں۔
چنانچہ تم اس قسم کے اختلافی مسائل کے بارے میں تمام آئمہ مذہب کو دیکھو گے کہ وہ مسئلہ کو پھیلا
کر بیان کرنے اور تمام اختلافی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد یہ بھی فرما دیتے ہیں کہ "یہ میرے
خیال میں احوط طریقہ ہے، یہ رائے مختار ہے" "یہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے" اور کبھی یوں
کہتے ہیں کہ "ہم تک صرف یہی حکم پہنچا ہے" اس کے شواہد المبسوط آثار محمدؒ اور اقوال شافعیؒ میں
بے شمار موجود ہیں۔ یہ وہ مبارک دور تھا جب دین کا چشمہ صافی شقاق و نزاع کے مہلک جراثیم
سے قریب قریب پاک تھا اور اجتہادی اختلافات جامہ ملت کے لئے مقراض کا کام نہیں دے
رہے تھے لیکن اس کے بعد تعصب کا طوفانی سیلاب آیا، نگاہوں کی وسعت کم ہونے لگی۔ لوگوں
نے بقیہ اختلافی پہلوؤں سے صرف نظر کر کے صرف ایک پہلو کو لے لیا۔ اب اختلافات کی نوعیت
پہلی سی نہ رہی بے حد اہمیت دے دی گئی۔ ان کی آڑ میں فرقہ پرستی وجود میں آ گئی۔ لوگوں کا
ذوق تحقیق، جمود سے بدل گیا، اور وہ اپنے آئمہ کے اختیار کردہ مسلک پر سختی سے جم گئے۔

اور یہ جو بعض علمائے سلف سے اپنے آئمہ کے مذاہب پر ہمیشہ قائم رہنے کی تاکید منقول
ہے۔ سو یہ یا تو ایک رجحان فطری کی بنا پر ہے کیونکہ ہر انسان اپنے پیشواؤں اور بزرگوں کی عادا
اور پسندیدہ چیزوں کو بڑی قدر اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے یہاں تک کہ ہم عام رسوم و رواج کے
اندر بھی اس رجحان فطری کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یا پھر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کے
دلائل کی عظمت اور قوت سے مرعوب تھے اور ان کے خیال میں یہ دلائل بہت ہی مضبوط اور ناقابل
تردید تھے۔ یہ اور اسی قسم کی اور وجہیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن بعض لوگوں کا یہ خیال کہ تعصب کی
سرشاری میں انہوں نے یہ کلمات کہے، محض وہم بلکہ سراسر بہتان ہے۔ (جاری ہے)

ایک گورنر وہ بھی تھے

شاہ بلیغ الدین

گورنر آپ نے بہت سے دیکھے ہونگے ہم نے تو انگریزی دور کے گورنر بھی دیکھے لیکن اپنے گورنروں کی بات ہی کچھ اور ہے ہماری گورنری کے لنکا دلیس سے کوئی باون گز سے کم کا راون تو ابھی تک نکلا ہی نہیں۔ ایک سردار نشتر کبھی کبھی یاد آ جاتے ہیں جو اپنا ذاتی اور سرکاری فون تک بھی الگ الگ رکھتے تھے جن کے اہل وعیال جھنڈے لہراتی گاڑیوں کو نہ خود چلا سکتے تھے نہ اپنے کام میں لا سکتے تھے۔ یہ ٹھاٹ باٹ تو صرف ایوبی دور میں دیکھنے کے تھے۔ پاکستان کا سرکاری خزانہ کسی کی دسترس سے محفوظ نہ رہا جس نے ڈالی بری نظر ڈالی۔ قانون ارباب اقتار کی گھر کی لونڈی اور نوکر شاہی ان کی کٹھ پتلی بنی رہی۔

الہ دین کا چراغ تو ان کے پاس نہ تھا لیکن اختیار کا جن انکی ہر خواہش پوری کرا دیتا تھا۔ رامش ورنگ کا کونسا کھیل تھا جو انہوں نے نہ کھیلا مغلیہ دور میں ایک محمد شاہ رنگیلا اور اودھ کا تعلقہ داروں میں ایک واجد علی شاہ تھا۔ ہماری پچاس سال کی تاریخ بھی خاصی رنگیلی ہے، پھر بھی سیاسی پارٹیوں کے طالع آزما اور ان کے چیلے چانٹے کہتے ہیں کہ "فرشتے کہاں سے لائیں" پتہ نہیں یہ لوگ یہ نعرہ لگا کر کس کو دھوکا دینا چاہتے ہیں وہ آدمی تھے یا فرشتے جنھوں نے پاکستان بنایا۔

اگر اس بات پر ذہن کھل جائے اور وہ آنکھیں کھول کر دیکھ سکیں تو چین، ملائیشیا، اور جنوبی کوریا کو دیکھ لیں جہاں فرشتے آدمیوں کے بھیس میں ملک وملت کی تعمیر کر رہے ہیں اور کسی گورنر یا وزیر کا بینک بیلنس یورپ اور سوئٹزرلینڈ کے بنکوں میں نہیں۔ نہ ان کی محل سرائیں یا خلوت کدے پیرس اور لندن میں ہیں۔

گورنروں کی باتیں اور انکی گھاتیں بھی قصوں کہانیوں کا روپ دھار لیتے ہیں ان میں کچھ سیاہ کاری کے افسانے ہیں کچھ خوف خدا کے قصے جن کے لئے شاعر کہتا ہے:

گاہے گاہے باز خواں ایں قصہ پارینہ را

اب یہ قصہ پارینہ سنیے ایک بادشاہ ہمارا تمہارا اللہ بادشاہ وہ تھا اکبر بادشاہ اس کا ایک گورنر تھا اس کے بارے میں لوگ کہتے تھے..... لکھ لٹ.... کیسے ہوئے ہیں؟ کم کسی نے دیکھے ہونگے

ایک زمانہ تھا کہ کوئی یہ بات کہتا تو لوگ باگ پوچھتے کہ تم نے خان مفلس کو تو نہیں دیکھا۔ لاہور ہی نہیں پنجاب کے علاقے میں دور دور تک یہ فقرہ مشہور تھا کہ خان مفلس غلام باساں ماں... مطلب یہ کہ صاحب کہ پاس کچھ بھی نہیں نوکروں کے پاس بہت کچھ ہے یہ ایک قصیدہ کا مصرعہ ہے یہ قصیدہ حسین خان ٹکریہ کی شان میں لکھا گیا تھا۔ حسین خان، ہمایوں اور اکبر کے زمانے سے مغلیہ خاندان کا ملازم اور سلطنت کا بہت بڑا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ ماثر الامراء میں ہے۔

ایک زمانے میں وہ لاہور کا گورنر تھا اور بڑے ٹھاٹ باٹ کا گورنر۔ ویسے وہ بڑا بھاری بھرکم دیدہ ور آدمی تھا۔ ہمت کا ایسا دھنی کہ میدان جنگ میں اترتا تو جاں پیچ کر لڑتا۔ جب لڑائی کے ہتھیار سجاتا تو دعا کرتا تھا کہ الٰہی شہادت دے یا فتح۔ کسی نے ایک بار لڑائی سے پہلے یہ جملہ سنا تو کہا کہ پہلے فتح کیوں نہیں مانگتے ہو؟

جواب دیا کہ جو دوست گزر گئے ان سے ملنے کی تڑپ ایسی ہے کہ جو دوست باقی رہ گئے ہیں ان کی محبت اس کے مقابلے میں کچھ کم نہیں!

وہ میدان جنگ ہی کا کھلاڑی نہیں تھا بلکہ علم کا بھی رسیا تھا اخلاق کا تو اتنا پیارا تھا کہ کم ہی ایسے شریف اور اللہ سے ڈرنے والے آدمی نظر آتے ہونگے۔ لاہور میں اس کا حال یہ تھا کہ کھانے کے وقت اس کا دروازہ کھلا رہتا۔ امیر غریب مسلم غیر مسلم کوئی قید نہیں تھی جو چاہتا آتا کھا کر چلا جاتا۔ کھانے میں بہتر سے بہتر چیزیں رکھی جاتیں، خان خود موجود ہوتا لیکن دسترخوان پر نہیں بیٹھتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لوٹا ہوتا جو کھانے آتا اس کے ہاتھ دھلاتا پھر اسے دسترخوان پر بٹھا کر دسترخوان کے اطراف چکر لگاتا رہتا، کبھی قاب بڑھاتا کبھی پانی پلاتا۔ ہر ایک سے کہتا کہ اللہ کا شکر ہے کہ آپ اپنا رزق میرے دسترخوان پر بیٹھ کر کھا رہے ہیں۔ مہمان رخصت ہو جاتے تب جا کر خان خود کھانا کھانے بیٹھتا۔

ملا بدایونی لکھتے ہیں کہ ''اس کے لئے دسترخوان پر جو کی روٹی رکھی جاتی کبھی چٹنی سے اور کبھی پانی سے روٹی کھا لیتا کسی نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ آخر اس میں راز کیا ہے، تو بولا کہ اچھی اچھی نعمتیں کس طرح کھاؤں مجھے اللہ کے رسول ﷺ یاد آتے ہیں۔ وہ کیا کچھ نہیں تھے لیکن آپ کے کھانے میں اکثر سوکھے ٹکڑے ہوتے، پلنگ اور نرم بچھونے پر کبھی نہ سوتا لوگ پوچھتے تو پوچھتا

کہ "آنحضرت کہاں نرم بچھونے پر سوتے تھے؟ نماز کبھی قضا نہ کی اور وہ بھی نماز باجماعت۔ اللہ نے گھنوں روپیہ دیا تھا لیکن اصطبل میں خاصے کا ایک ہی گھوڑا ہوتا تھا کبھی کوئی مستحق آ جاتا تو وہ بھی لے جاتا۔ سفر میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ نوکر تو سوار ہے اور خود پیدل چلا جا رہا ہے۔ لوگ پوچھتے تو معلوم ہوتا کہ اپنی سواری کا گھوڑا کسی کو تحفتاً دے دیا، اسی لئے پیدل جا رہا ہے۔

جب بھی کسی کو دیتا شرماتا رہتا اکڑتا نہیں تھا صاف کہتا تھا.... اللہ کا دیا ہے اور تمہاری قسمت کا ہے میں تو صرف اس کا امین تھا، وعدے کا سچا قول کا پکا تھا۔ قسم کھائی تھی کہ روپیہ جمع نہ کروں گا۔

کہتا تھا کہ جو روپیہ میرے پاس آتا ہے، جب تک اسے مستحقین میں بانٹ نہیں دیتا پہلو میں تیر سا کھٹکتا رہتا ہے، ابھی جاگیر سے رقم آنے بھی نہ پاتی تھی کہ مستحقین کو رقوم کی چٹھیاں بانٹ دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک بزرگ نے سمجھانے کی کوشش کی، اس نے فرمایا کہ خان! کچھ روپے بچایا بھی کرو، پوچھا کس کے لئے؟

انہوں نے کہا.... بیوی بچوں کے لئے اور کس کے لئے۔ وہ بولا حضرت یہ بتایئے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا کیا طریقہ تھا؟ سرور کونین ﷺ کے پاس غنیمت اور ہدیوں میں بڑی بڑی رقمیں آتی تھیں، آپ سب اللہ کی راہ میں بانٹ دیتے تھے، یا بچا کر رکھتے تھے؟ نصیحت کرنے والا منہ دیکھتا رہ گیا۔ حسین خان ٹکریہ اسوہ حسنہ پر عمل کرتا تھا اور بڑے اخلاص سے یہ عمل کرتا تھا کسی دکھاوے یا ناز و غرور کے لئے نہیں۔ نصیحت کرنے والے بزرگ سے اس نے کہا حضرت امید تو یہ تھی کہ آپ دنیا کی حرص و ہوس سے بچنے کی تعلیم دیں گے آپ تو الٹا ہمیں دنیا میں پھنسا رہے ہیں۔

سوداگر پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ ایرانی، ترکی گھوڑے لاتے اور کہتے آپ کے اور اللہ کے سپرد، بہتر سے بہتر داموں میں انہیں خریدتا اور جو موجود ہوتے ان میں بانٹ دیتا جنہیں نہ دے سکتا ان سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگ لیتا۔

مورخین لکھتے ہیں کہ جتنا وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا اتنا ہی اسے اللہ دیتا بھی تھا۔ یہ شاید رسول اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل کرنے کا نتیجہ تھا کبھی کسی نے اس کا ہاتھ رکا ہوا نہیں دیکھا۔

مہدی اول

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ اہل اسلام میں بعض ایسے تصورات نفوذ کر گئے ہیں جن کو اسلامی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ ظاہری اسلام قبول کرنے والوں میں منافقوں کی تھوڑی بہت جماعت ہر دور میں رہی ہے۔ یہ کسی مفاد کی خاطر مسلمان ہوئے جس مذہب کو کوئی چھوڑ کر آیا وہ اپنے ساتھ کچھ غیر اسلامی تصورات بھی لایا۔ اور انہیں اسلامی رنگ دے کر مسلمانوں میں پھیلا دیا۔ اور وہ تصورات رفتہ رفتہ اسلام کا جزو بن گئے۔ غیر اسلامی تصورات کو اہل اسلام میں پھیلانے کا ایک آسان نسخہ ابتداء میں یہ تھا کہ جو کچھ مناسب سمجھا اچھے الفاظ میں کہہ دیا اور اسے منسوب کر دیا رسول اللہ ﷺ کی طرف۔ آنحضرت ﷺ کا نام سنتے ہی بہ تقاضائے ایمانی فرط عقیدت سے مسلمانوں کی گردنیں جھک جاتیں۔ اور وہ اسے فرمان رسول ﷺ سمجھ کر بے چون وچرا قبول کر لیتے۔ یہ تو ائمہ حدیث کا احسان ہے کہ انہوں نے بڑی عرق ریزی ومحنت شاقہ سے غلط اور صحیح کو ممتاز کر کے صحیح روایات کو اپنی تالیفات میں محفوظ کر لیا۔ تاہم وہ انسان تھے، ان کی کوششیں سعی مشکور ہیں مگر انسانی تسامحات سے بالکل محفوظ رہنا ناممکن تھا۔ کچھ نہ کچھ چیزیں ایسی آ ہی گئیں جن کو اسلام کا جزو قرار دینا مشکل ہے۔ حیات مسیحؑ، ظہور مہدی، عقیدہ امامت وغیرہ ہماری تحقیق میں ایسے ہی تصورات ہیں۔ اس وقت مقصود ظہور مہدی کا ذکر کرنا ہے جو دراصل عقیدہ امامت کا ہی ایک جزو ہے۔ اس لئے پہلے اسی پر ایک سرسری نظر ڈال لینا چاہیے۔

قرآنی اصطلاح میں امام کا لفظ لیڈر کے لئے آتا ہے جس کے معنی ہیں راہنما، راہبر۔ سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **انی جاعلک للناس اماماً** ”میں تمہیں تمام انسانوں کے لئے امام بناؤں گا“۔ ایک پیغمبر بہرحال اپنی قوم کا اصلی لیڈر ہوتا ہے۔ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو جو کتاب دی گئی اسے بھی امام کہا گیا ہے۔

کتاب کو امام اس لئے کہا گیا کہ اسی کے ذریعے راہنمائی ہوتی ہے۔ نبی یا رسول کتاب کے بغیر نہیں ہوتا...... اور کتاب نبی ورسول کے سوا اور کسی پر نہیں نازل ہوتی۔ دونوں لازم وملزوم ہیں اور دونوں ہی رہبر و امام ہیں۔

نبوت و امامت کا فرق

یہاں ایک بات صاف کر لینی چاہیے کہ نبوت سراسر وہبی ہوتی ہے اور کسب کو اس میں دخل نہیں ہوتا۔ بخلاف اس کے امامت اکتسابی ہوتی ہے۔ یہ دعا تو ہمیں سکھائی گئی ہے:

واجعلنا للمتقین اماماً ''اے اللہ ہمیں...... محض عوام ہی کا نہیں بلکہ متقیوں کا امام بنا''۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ دعا کرے کہ:

واجعلنا من النبیین ''اے اللہ ہمیں نبی بنا دے'' (نعوذ باللہ من ذالک)

تو اس کی جگہ صرف دماغی شفاخانے ہی میں ہو سکتی ہے۔ یہ فرق صرف اس لئے ہے کہ دعا صرف اس نعمت کی کی جاتی ہے جس میں انسانی اکتساب کو دخل ہو۔ امامت اکتسابی ہوتی ہے اس لئے اس کی دعا کرنی درست ہے مگر نبوت وہبی ہوتی ہے اس لئے اس کی دعا بھی درست نہیں۔

۲۔ دوسرا فرق امامت و نبوت میں یہ ہے کہ نبی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور امامت کا دعویٰ نہیں کیا جاتا بلکہ امام کا کوئی کارنامہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اسے امام مان لیتے ہیں۔

۳۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ دعوائے نبوت ماننے نہ ماننے پر ایمان و کفر کا انحصار ہوتا ہے جو مانے گا وہ مومن ہوگا اور جو نہ مانے گا وہ کافر کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے امامت نہ دعویٰ کی چیز ہے نہ اس پر ایمان لانا فرض ہے۔ کوئی ابو حنیفہؒ یا ان کے استاد جناب جعفر صادق یا آغا خاں کو امام نہ بنائے تو وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہ حنفی یا شیعہ اسمٰعیلی نہ رہے گا لیکن اس کے مسلمان ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔

۴۔ چوتھا فرق یہ ہے کہ نبوت ایک منصوص حقیقت ہے اس لئے اس کے اقرار و انکار پر کفر و ایمان کا دارومدار ہے۔ لیکن امامت کوئی منصب یا عہدہ نہیں جو منصوص من اللہ ہو۔ اگر وہ سیاسی امامت ہے تو قومی نظم و ضبط اور ڈسپلن کا ایک لازمی تقاضا ہے اسے تسلیم کر لینا۔ اگر علمی و فنی امامت ہے تو عقل و انصاف کا اقتضا ہے اسے مان لینا۔ اسی طرح اگر روحانی و اخلاقی امامت ہے تو اسے بھی احتراماً و انصافاً مان لینا چاہیے۔ لیکن بہرحال اس پر کفر و ایمان موقوف نہیں۔ گاما پہلوان کشتی کا امام ہے، غزالی تصوف کے اور ابو حنیفہؒ فقہ کے امام ہیں، ابن خلدون فن تاریخ کے امام ہیں، شیخ عبدالقادر جیلانی روحانیت کے امام ہیں۔ یہ ساری امامتیں ایسی ہیں کہ جن میں واقعیت ہے، صداقت ہے اور ان کو نہ تسلیم کرنے والا فرسودہ دماغ انسان ہے۔ اگر وہ ضد اور ہٹ دھرمی سے

ایسا کرتا ہے تو انصاف وعقل کا خون کرتا ہے اور اگر تحقیق سے کام لے کر انکار کرتا ہے تو وہ ایک خاص اجتہادی غلطی کرتا ہے۔ یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن وہ مسلمان ہی رہے گا، کافر نہ ہوگا۔ ان اماموں کو ماننا تقریباً ایسا ہی اعتراف حقیقت ہے جیسے مارکونی کو ریڈیو کا اور آئن سٹائین کو نظریہ اضافیت کا موجد ماننا۔ اس پر کفر وایمان کا انحصار نہیں۔

۵۔ پانچواں فرق یہ ہے کہ کائنات کا ایک ایک فرد نبی کو نبی مانے یا سب انکار کردیں نبی بہر حال نبی رہے گا۔ اسے نبوت کے عہدہ سے کوئی معزول نہیں کرسکتا لیکن امام اپنی امامت سے معزول ہوسکتا ہے اور ہوتا رہا ہے۔

۶۔ چھٹا فرق یہ ہے کہ نبوت کا دروازہ بند ہوچکا لیکن امامت کا دروازہ قیامت تک کے لئے کھلا ہے۔ ایک ہی وقت میں مختلف شعبوں کے بہت سے ائمہ ہوسکتے ہیں اور ایک ہی فن کے بھی متعدد امام ہوسکتے ہیں۔

۷۔ ساتواں فرق یہ ہے کہ اللہ، ملائکہ، کتب سماوی، انبیاء اور آخرت پر ایمان لانا ایک منصوص حقیقت ہے جس سے انکار ممکن ہی نہیں (**کل اٰمن باللہ و ملائکتہ و کتبہ ورسلہ......یومنون باللہ و الیوم الاٰخر**......وغیرہ) لیکن امامت پر ایمان لانے کا کوئی ذکر بلکہ اشارہ بھی کتاب وسنت کی کسی نص میں موجود نہیں۔ نہ اہل سنت کے چار اماموں کا کوئی ذکر ہے نہ اسماعیلیوں کے چھ اماموں کا اور نہ اثنا عشریوں کے بارہ اماموں کا۔ اس لئے یہ داخل ایمانیات ہی نہیں۔ یہ صرف ایک ذاتی ذوق ہے جو ان اکابر کی اعلیٰ کارگزاریوں کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے اور تجربہ وعقل اور انصاف ان کی امامت کا فیصلہ دے دیتے ہیں۔

لفظ امام کا استعمال

مذکورہ بالا وجوہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاں امام کہنے سے علمی وفنی اور جزوی امامت کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہو۔ وہاں یہ لفظ استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن جہاں اس لفظ سے وہ مخصوص تصور امامت پیدا ہوتا ہو کہ یہ امام نبی کی طرح منصوص من اللہ ہے، داخل ایمانیات ہے، نبی کی طرح معصوم اور صاحب الہام ہے، اور اس کا فرمان آخری حجت ہے وغیرہ وغیرہ تو ایسی جگہ میں لفظ امام استعمال کرنے سے احتیاط اولےٰ ہے۔ ایسا تصور امامت نبوت کی نقیض ہے یا یوں کہیے کہ باب نبوت کھولنے کے مترادف ہے۔ ان اکابر امت کو امام کہتے وقت خواہ ہمارے ذہن میں مخصوص کلی تصور امامت نہ ہو بلکہ امام سخاوت، امام علم اور امام شجاعت ہی محدود اور جزئی تصور

امامت ہو لیکن اس سے احتیاط اسی طرح لازم ہے جس طرح **انظرنا** کی بجائے **راعنا** کہنے سے۔ **راعنا** کہنے والے مسلمانوں کے دل استہزاء کے تصور سے بالکل خالی تھے، لیکن چونکہ اس میں اہانت واستہزاء کا پہلو پیدا ہوتا تھا اس لئے اس لفظ کے استعمال سے روک دیا گیا۔ لفظ امام میں بھی اس احتیاط کو ملحوظ رکھنا قیاس صحیح ہے۔ قیاس مع الفارق نہیں۔

اس عقیدے کا سبب

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ عجم میں جہاں کے اذہان شاہ پرستی کے عادی ہو چکے تھے، وہ اسلامی مساوات و جمہوریت کو اتنی آسانی سے قبول نہ کر سکتے تھے۔ کسروی ملوکیت میں نسلی جانشینی اور شاہی اختیارات کی جو روایت چلی آرہی تھی وہ اتنی جلدی بدل نہیں سکتی تھی۔ ان کا جذبہ تو اسلامی ہی ہوگا لیکن عقیدہ ظل اللہ کی پیاس ان کے اندر ایک خلا پیدا کر رہی تھی۔ لہٰذا اس کا بدل ''امامت'' کو بنا لیا گیا۔ دونوں میں سیاست اور روحانیت کا فرق تو رہا لیکن جذبہ وہی کام کر رہا تھا۔ یہاں بھی وہی آمریت اور وہی نسلیت روحانی لبادہ اوڑھ کر سامنے آ گئی اور عقیدہ بن گئی۔

معاملہ یہیں تک رہتا تو غنیمت تھا لیکن اس میں ایک قسم کا ڈاگما بھی شامل ہو گیا۔ اور وہ یہ کہ ایک امام صاحب غار سامرہ میں غائب ہو گئے جن کا تقریباً ہزار سال سے انتظار کیا جا رہا ہے اور آج تک انہوں نے ظہور نہیں فرمایا۔ عیسائیوں کا بھی یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی آڑے وقت میں حضرت مسیح آسمان سے نازل ہو کر سب کچھ ٹھیک کر لیں گے اور آج دنیا تقریباً دو ہزار سال سے ان کا بھی انتظار کر رہی ہے۔

عقیدہ غائب کی وجہ

ہوتا یہ ہے کہ ہر پٹی ہوئی قوم کسی غائب کا سہارا لیا کرتی ہے اور یہ مشہور کرتی ہے کہ فلاں صاحب مرے نہیں ہیں بلکہ پوشیدہ طریقے سے مقابلے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اور عنقریب وہ ظاہر ہونگے میرے ایک عزیز دوست مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم سے ایک شخص عظیم آباد پٹنہ میں ملا۔ جو بی۔ اے تھا اور صادق پور پٹنہ کا رہنے والا اہل حدیث تھا۔ اس نے کہا کہ: ''اجی یہ جو آج کل فقیر اے پی کا بڑا چرچا ہے یہ کہیں سید احمد بریلوی تو نہیں؟'' مولانا مسعود عالم اس کی زبان سے یہ سن کر حیران رہ گئے اور دیر تک سوچتے رہے کہ یا اللہ! تعلیم یافتہ حضرات بھی اس روشنی کے دور میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سید صاحب ابھی تک زندہ ہیں اور وہ خروج فرمائیں گے۔

ہم نے انور پاشا کے متعلق بھی عرصہ دراز تک لوگوں کو اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا پایا۔ سبھاش

چندر بوس اور ہٹلر کے بارے میں بھی ایک مدت تک یہی غلط فہمی پھیلی رہی۔ اگر یہ لوگ بھی سید احمد صاحب کی طرح کچھ تقدیس کے مالک ہوتے تو ان کی امت بھی یہی عقیدہ بنا لیتی کہ وہ زندہ ہیں اور کبھی نہ کبھی نکلیں گے۔ اس قسم کی باتیں حوصلے بلند کرنے کے لئے یا عارضی سیاسی فائدہ حاصل کرنے کے لئے فوجی نقطہ نگاہ سے تو شاید صحیح قرار دی جائیں لیکن اسے عقیدہ بنا لینے کا اثر بالکل الٹا نکلتا ہے۔ اور قوم اپنے قوائے عمل کو "مردے از غیب بروں آید و کارے بکند" کے انتظار میں معطل کر کے بیٹھ جاتی ہے اور کسی کے ظہور کے انتظار میں نتیجے کا الٹا ظہور ہوتا ہے۔

کئی مہدی

پھر یہ عجیب بات ہے کہ ظہور مہدی کی نا قابل اعتبار روایات نے بہت سے مہدی پیدا کر دیئے۔ مہدی سوڈانی، مہدی جونپوری اور مہدی پنجابی وغیرہ کئی دعویداران مہدویت پیدا ہوئے اور کمال یہ ہے کہ مہدی منتظر کی جو کارگزاریاں روایتوں میں بیان ہوئی ہیں..... کہ وہ تسخیر عالم کرے گا اور دنیا میں امن و سلامتی اور خوش حالی پیدا کر دے گا اور وہ نزول مسیح اور قتل دجال کے بعد ظاہر ہو گا وغیرہ وغیرہ ان میں سے کوئی بات بھی ان مہدیوں کے حق میں پوری نہ ہوئی۔ صرف دعوائے مہدیت باقی رہ گیا۔

پہلا دعویدار

لیکن اس دعوائے مہدویت کا آغاز کب سے ہوا اور کس نے کیا؟ یہی ہے وہ سوال جو اس مضمون کا اصل موضوع ہے۔ اس سوال کے جواب کو ایک اثنا عشری مورخ محمد بن علی بن طباطبا المعروف بہ ابن طقطقی کی زبان سے سنیئے وہ اپنی مشہور عالم اور جامع تاریخ "**الفخری فی الآداب السلطانیة والدول الاسلامیة**" میں یوں لکھتا ہے:

"نفس زکیہ (محمد بن عبداللہ المحض بن حسن بن حسن بن علی ابن ابی طالب) اپنے فضل، شرف، دین، علم، شجاعت، فصاحت، اثر، شرافت اور دانائی کے لحاظ سے بنی ہاشم کے چوٹی کے لوگوں میں شمار ہوتے تھے۔ ابتداء میں انہوں نے لوگوں میں یہ مشہور کر رکھا تھا کہ میں وہ مہدی ہوں جس کی بشارت دی گئی ہے ان کے والد عبداللہ محض نے بہت سی ٹولیوں کے دلوں میں یہی بات جما دی تھی۔ وہ یہ روایت بیان کرتے تھے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: اگر دنیا ختم ہونے میں ایک دن بھی باقی رہ جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس دن کو لمبا کر دے گا تا آنکہ وہ اس دن ہمارے مہدی یا قائم کو بھیجے گا۔ اس کا نام میرے نام جیسا اور اس کے باپ کا نام میرے باپ کے

م جیسا ہوگا"۔

عبداللہ محض اپنے فرزند محمد کے بارے میں لوگوں سے کہتے پھرتے تھے کہ یہی وہ مہدی ہے جس کی بشارت دی گئی ہے۔ یہی ہے محمد بن عبداللہ......

اس دعوائے مہدویت کا نتیجہ اور پھر حشر کیا ہوا؟ وہ بھی سن لیجئے۔ محمد بن عبداللہ محض (نفس زکیہ) نے اہل مدینہ کو اپنی حمایت میں لے کر مدینے پر قبضہ کرلیا۔ خلیفہ منصور عباسی نے جو مدینے کا امیر مقرر کیا تھا اسے معزول کر کے اپنا عامل و قاضی مقرر کیا۔ قید خانوں کے دروازے توڑ کر تمام قیدیوں کو باہر نکال لیا۔ پھر ایک عرصے تک منصور اور نفس زکیہ کے درمیان ایسی دلچسپ خط و کتابت ہوتی رہی جو خطابت و کتابت اور ادب کا شاہکار ہے۔ اس میں ہر ایک نے اپنے اپنے استحقاق خلافت کو ثابت کرنے کی کوشش کی۔ آخر میں منصور نے اپنے برادر زادے موسیٰ بن عیسیٰ کو ایک بھاری لشکر دے کر روانہ کیا۔ مدینے سے قریب ہی ایک جگہ دونوں کا مقابلہ ہوا۔ منصور کو فتح ہوئی اور نفس زکیہ قتل کئے گئے۔ اور ان کا سر منصور کی پاس بھیج دیا گیا۔ یہ ۱۴۵ھ کا واقعہ ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا، یہ عجیب مہدی ہے جو صرف اسمی مناسبت سے مہدی بن گیا اور مہدی کا کوئی کام نہ کیا۔ نہ دجال ظاہر ہوا نہ مسیح نے ظاہر ہو کر دجال کو قتل کیا۔ نہ تسخیر عالم ہوئی نہ دنیا میں امن، سلامتی اور خوش حالی پیدا ہوئی۔ کچھ بھی نہ ہوا بلکہ وہ الٹا خود قتل ہوا اور اس کا سر منصور کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ اس ہزیمت و شکست کے باوجود وہ مہدی تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ محض ایک ناکام سیاسی مقصد حاصل کرنے کے لئے آمد مہدی کی یہ حدیث گھڑ لی گئی تھی۔ اور اگر یہ حدیث صحیح تھی تو مہدویت کا یہ مدعی اپنے علم و فضل، شجاعت و فصاحت، دانائی و بزرگی وغیرہ کے باوجود اپنے دعوائے مہدویت میں سچا ثابت نہیں ہوتا بلکہ "نفس زکیہ" کا لقب بھی اسے زیب نہیں دیتا۔ پھر لطف یہ ہے کہ جناب حسنؓ بن علیؓ کا پوتا عبداللہ المحض بھی محض خود غلط نظر آتا ہے جو اپنے فرزند نفس زکیہ کو مہدی موعود ثابت کرنے میں سارا زور صرف کر دیتا ہے۔

یہ تھا مہدی اول۔ لیکن اس کے بعد بھی جتنے مدعیان مہدویت پیدا ہوئے ان کا بھی یہی انجام ہوا اور ناکامی و نامرادی میں وہ بھی اس مہدی اول کے مثیل ثابت ہوئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ سارے مہدیان کرام یہیں دنیا میں پیدا ہوئے، یہیں پرورش پائی، یہیں پڑھے لیکن مہدی آخر الزمان کسی غار میں غائب ہوگئے اور وہیں ابھی تک تقریباً ہزار سال سے تیاریاں کر رہے ہیں اور خدا جانے کب تک کرتے رہیں گے۔ اس سائنس کی دور میں یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے۔

صنعتی ارتقاء، اسلام کی روشنی میں

ظفر اقبال اعوان

اسلام کے نزدیک اصل زندگی آخرت کی ہے۔ لیکن اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے ماننے والے دنیا میں وقار کے ساتھ رہیں۔ جدید دور صنعتی دور ہے، اسلام صنعتی ارتقاء کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے جس کا مفہوم یہ ہے: ''ہم نے لوہا اتارا جس میں شدید ہیبت ہے اور لوگوں کے لئے بہت سا نفع ہے''۔ (سورۃ الحدید)

کشتی حضرت نوح علیہ السلام کی ایجاد ہے۔ قرآن کریم میں کشتی کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس میں عقل و شعور رکھنے والوں کے لئے ہدایات و نشانیاں موجود ہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ صنعتی ایجادات کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر ایمان و یقین کا ایک ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''بے شک زمین اور آسمان کی تخلیق میں، دن رات کے آنے جانے میں اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کا نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جس کو اللہ تعالیٰ نے بلندی سے اتارا اور اس کے ذریعے زمین کو زندگی بخشی جب کہ وہ مردہ سی تھی پھر اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلا دیئے اور ہواؤں کے ادل بدل میں اور اس بادل میں جو زمین و آسمان کے درمیان مسخر رہتا ہے (ان تمام مظاہر) میں عقل مندوں کے لئے نشانیاں ہیں''۔ (سورۃ البقرہ)

حضرت ادریس علیہ السلام پہلے انسان ہیں جنہوں نے قلم سے لکھنا اور کپڑا سینا ایجاد کیا۔ سب سے پہلے ناپ تول کے طریقے بھی آپ ہی نے ایجاد فرمائے۔ اسلحہ تیار کر کے بنو قابیل سے جہاد کیا۔ حضرت ذکریا علیہ السلام بڑھئی کا کام کرتے تھے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے جس کا مفہوم یہ ہے: ''ہم نے (حضرت) داؤد علیہ السلام کے لئے لوہا نرم کر دیا''۔ اس سلسلے میں معارف القرآن میں لکھا ہے کہ لوہا ان کے ہاتھ میں آ کر نرم ہو جاتا۔ خود بخود نرم ہو جاتا ہو کہ اس کو جس طرف موڑیں مڑ جائے اور باریک یا موٹا کرنا چاہیں تو ہو جائے جیسے موم ہوتا ہے یا اس طرح کہ ان کو آگ میں پگھلا کر نرم کرنے کی تدبیر بتلا دی جو سب لوہے کے کارخانوں میں آج استعمال کی جاتی ہے۔ قرآن حکیم کے ارشاد کے مطابق حضرت داؤد علیہ السلام کو زرہ سازی کی تعلیم دی گئی۔ یعنی آپ زرہیں بناتے تھے۔

حضور اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک جس کا مفہوم یہ ہے ''جو انسان اپنے ہاتھوں سے کما کر کھائے اس سے بہتر کوئی کھانا نہیں'' اور اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی

سے کھاتے تھے (حضرت داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے)۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد مبارک کا مفہوم ہے کہ "اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو کسی صنعت میں کمال پیدا کرے"۔

قرآن حکیم کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا تھا جس پر ان کا تخت چلتا وہ جہاں چاہتے بہت جلد آسانی سے پہنچ جاتے تھے۔ علامہ مناظر احسن گیلانی اپنی کتاب اسلامی معاشیات میں لکھتے ہیں کہ عام خیال یہی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہوا پر اقتدار معجزاتی طور پر دیا گیا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا کی رفتار کو تیز اور آہستہ کر لیتے تھے یعنی ہوا سے اپنی مرضی سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ علامہ لکھتے ہیں کہ ہوا کے کسی خاص قانون کا علم جس کے بعد اس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لینا آسان ہو جائے اس کے انکار کی تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام کو ہوا کے کسی خاص قانون کا علم دیا گیا تھا جس سے وہ اپنی مرضی سے کام لیتے تھے۔

غور کیا جائے تو سواری کے جانور اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے مسخر کر دیئے ہیں۔ ہم انہیں نکیل ڈال کر ان کی رفتار بڑھا بھی لیتے ہیں اور کم بھی کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ہم دوسری سواریوں یعنی کاروں، ریل گاڑیوں اور ہوائی جہاز، جنگی طیارے چلانے والے ان سواریوں کی رفتار تیز بھی کر لیتے ہیں اور آہستہ بھی کر لیتے ہیں۔ ایک مسلمان جو کسی سواری کو چلاتا ہے (ڈرائیو کرتا ہے) قرآن حکیم میں مذکور یہ دعا کرتا ہے:

"پاک ہے وہ ذات جس نے اس سواری کو ہمارے لئے مسخر کر دیا ہے، ورنہ ہم تو اس کو قابو کرنے والے نہ تھے اور ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹ کر جانا ہے"۔

حافظ شمس الدین ذہبی کی تالیف الطب النبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بعض سلف صالحین سے یہ نقل کیا گیا ہے کہ انسان کے لئے جتنی صنعتوں کی ضرورت ہے ان کی ابتداء کسی پیغمبر کے ذریعے عمل میں آئی۔ پھر حسب ضرورت اس میں اضافے اور سہولتیں مختلف زمانوں میں ہوتی رہیں۔ سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی طرف جو وحی آئی اس کا بیشتر حصہ زمین کی آباد کاری اور مختلف صنعتوں سے متعلق ہے۔ بوجھ اٹھانے کے لئے پہیوں کے ذریعے چلنے والی گاڑی کی ایجاد بھی اسی سلسلہ میں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ اشیائے ضرورت کی صنعت کاری اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو سکھائی گئی۔

حضرت ذوالقرنین کے قصے میں لوہے کی چادروں اور پگھلے ہوئے تانبے کا پتا چلتا ہے۔

قرآن کریم میں ظروف سازی کی صنعت کا اشارہ بھی ملتا ہے۔ قرآن مجید نے نئی نئی سواریوں کے وجود میں آنے کی خبر بھی دے دی۔ ارشاد ربانی ہے جس کا مفہوم یہ ہے "اور اس نے یعنی اللہ تعالیٰ نے گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا کئے تمہاری سواری اور تمہاری زینت کے لئے اور وہ (آئندہ) ایسی سواریاں پیدا کرے گا جن کو تم اس وقت نہیں جانتے"۔

نزول قرآن کے وقت ریل گاڑیاں، کاریں اور ہوائی جہاز نہ تھے۔ پھر بعد میں یہ ایجاد ہوئے جن کی وجہ سے سفر تیزی سے طے ہونا شروع ہو گئے، تجارت میں اضافہ ہوا، معاشی ترقی ہوئی۔ پس ایجادات کی صلاحیت بھی انسان کو اللہ تعالیٰ نے عطا کی ہے۔

صنعت کاری کی جہتیں

اسلام میں ایسے کھیلوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے جو نفع بخش ہوں اور جہاد میں کام دیں، مثلاً تیز اندازی۔ آج کے دور میں بندوق کے ذریعے نشانہ بازی، دور مار ہتھیاروں کا استعمال، گھڑ سواری، کار، موٹر سائیکل، بس، ٹرین اور جہاز کا چلانا سیکھنا (ٹریننگ کے ذریعے) تیراکی وغیرہ یہ چیزیں اس نیت سے سیکھی جائیں کہ جہاد میں کام آئیں گی تو ثواب ہے۔

اسی طرح امت مسلمہ کو صنعتی ترقی کی مندرجہ ذیل جہتوں کو اپنانا چاہیے۔

1- جہت جنگی، 2- جہت معاشی، 3- جہت نفس انسانی

جہت جنگی

جنگی لحاظ سے امت مسلمہ کو طاقتور بنانا بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر سیاسی قوت کا حصول ممکن نہیں۔ جنگی صنعت کی ترقی کی طرف خصوصی توجہ اس لئے ضروری ہے کہ کافروں کے سیاسی غلبے سے بچا جا سکے۔ اگر کافر غلبہ پالیں گے تو مسلمانوں کو بہت سے فتنوں میں اور مشکلات میں مبتلا کر دیں گے اور انہیں دین اسلام سے دور کرنے کی کوشش کریں گے۔ ایک حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ گھڑ سواری کیا کرو اور تیر اندازی کیا کرو، تمہاری تیر اندازی مجھے تمہاری گھڑ سواری سے زیادہ پسند ہے۔ اس طرح آپ ﷺ نے قریب کی جنگ کی نسبت دور کی جنگ کو زیادہ پسند فرمایا ہے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ زیادہ سے زیادہ دور کی جنگ کی صلاحیت پیدا کریں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ جنگی طیارے بنائیں، میزائل سازی کریں، ٹینک سازی کریں۔ آج امریکہ دور کی جنگ کی بہت زیادہ قوت رکھتا ہے۔ اس کے پاس تیز ترین طیارے اور دور مار میزائل ہیں جن کی وجہ سے

(دنیا) تیں اس کے سامنے بے بس ہیں۔ اس طاقت کے بل بوتے پر اس نے افغانستان اور عراق میں تباہی مچادی۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ مسلم ممالک کی پالیسیوں پر بہت اثر انداز ہو رہا ہے۔

اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ عالمی استعمار امریکہ اسلامی ممالک میں نصاب تعلیم کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔ دور کی جنگ میں ہم بالخصوص کوشش کریں کہ ہماری قوت و طاقت دشمن کے مقابلے کی ہو۔ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک کا مفہوم ہے کہ تم بھی اپنے دشمنوں جیسے اسلحوں سے لیس رہو۔ (بحوالہ امت مسلمہ رہبر اور مثالی امت)

جب ہماری قوت و طاقت اور ہمارا اسلحہ بالخصوص دور کی جنگ میں دشمن کے مقابلہ کا ہوگا تو دشمن ہمارا استحصال نہیں کر سکے گا۔ ہم پر اپنی پالیسیاں نہیں ٹھونس سکے گا۔ اسلامی ریاست کا کام ہے کہ اسلحہ سازی کے کارخانے بنائے۔ اعلیٰ جنگی طیارے، میزائل اور بہترین حرب و ضرب کے آلات ٹینک بنائے۔ سائنس دانوں اور انجینئرز کی سرپرستی کی جائے۔ عہد نبوی ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں مسلمانوں نے جنگی صنعت میں ترقی کی۔

جہت معاشی

ایسے صنعتی ارتقاء کی طرف توجہ بہت ضروری ہے کہ جس سے مسلم ممالک کا معاشی استحکام ہوتا ہے۔ خصوصاً ایسے آلات و مشین سازی جس سے زرعی پیداوار بڑھے، اپنے معدنی ذخائر نکالے جا سکیں، نہریں کھودی جا سکیں، سڑکیں بنائی جا سکیں اور تیز رفتار ذرائع نقل و حمل خود بنانے میں مہارت حاصل ہو جس سے تجارت بڑھے۔ اگر ہم ایسی صنعتیں خود بنانے میں مہارت حاصل نہیں کریں گے تو غیر مسلم اقوام سے مدد مانگنی پڑے گی۔ وہ ہماری معدنیات نکالنے کے بہانے آہستہ آہستہ ملکی و ملی معاملات میں داخل ہو کر نقصان پہنچائیں گے۔

اسلامی ریاست کا یہ کام ہے کہ معاشی قوت بڑھانے کے لئے بھی صنعتی ترقی کی طرف توجہ دے۔ اسلامی ریاست کا کام یہ ہے کہ ایسے اقدامات کرے جن سے ٹیکس کم سے کم ہوں اور سرمایہ کاری بڑھے۔ ظہور اسلام سے پہلے محصول چونگی کی وجہ سے تجارت میں بڑی رکاوٹیں تھیں۔ حضور اکرم ﷺ نے نہ صرف چونگی کی لعنت ہی ختم کی بلکہ جزیرۃ العرب کی تسخیر کے بعد تمام ملک میں مدینہ کی طرح آزادانہ درآمدات و برآمدات کی اجازت دے کر بین الاقوامی تجارت کی داغ بیل ڈالی جس سے تجارت کو فروغ ہوا اور صنعت کی ترقی کو بھی تحریک ہوئی۔

جہت نفع انسانی

حدیث نبوی ﷺ کا مفہوم ہے کہ لوگوں میں بہترین وہ ہے جس سے دوسرے انسانوں کو فائدہ پہنچے۔

صنعتی ارتقاء کی جہت اس طرف بھی ہونی چاہیے جس سے انسانیت کو نفع ہو، لوگوں کی مشکلات دور ہوں۔ بالخصوص طب کے میدان میں خصوصی توجہ دی جائے۔ بیماریوں کی تشخیص کے آلات و مشینیں بنائی جائیں، ایجاد کی جائیں، آلات جراحی میں ترقی کی جائے۔ امام جوزیؒ نے اپنی کتاب "طب نبویؐ" میں یہ حدیث بیان کی ہے کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک شخص کی عیادت کو گئے۔ مریض کی پشت پر ورم تھا، آپ ﷺ نے فرمایا اس کی جراحی کر دو چنانچہ اس مریض کی جراحی کر دی گئی اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں عمل جراحی کے دوران موجود تھا اور رسول اللہ ﷺ مشاہدہ کرتے رہے۔

امام الجوزیؒ نے جو دوسری حدیث بیان کی ہے وہ حضرت ابو ہریرہؓ سے منسوب ہے جس کے مطابق حضور اکرم ﷺ نے ایک طبیب کو مریض کا پیٹ شق کر کے پانی نکالنے کا حکم دیا۔ جراحی کے متعلق یہ دونوں احادیث حضور اکرم ﷺ کا جراحی کے لئے ضرورت اور اجازت کا اشارہ دیتی ہیں۔ انہی اشاروں کی روشنی میں مسلمان طبیبوں نے عمل جراحی میں خوب ترقی کی۔ کئی آلات جراحی ایجاد کیے تا کہ انسانوں کو تکلیف سے نجات دلوائیں۔ اس طرح مسلمانوں نے آلات جراحی کی صنعت میں ترقی کی۔

صنعت کاروں کے لئے خوشخبری

ایک تو ہمیں اپنے صنعتی ارتقاء کی جہت جنگی، معاشی اور نفع انسانی کے حوالے سے رکھنی چاہیے اور پھر ہم اس جہت میں حصول ثواب کی نیت رکھیں۔ ہماری نیت میں صنعتی ترقی کا مقصد اسلام کی سر بلندی اور امت مسلمہ کی قوت و مضبوطی ہو، اس سے ہمیں ثواب ہوگا۔

ایک حدیث میں رسول اکرم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جو صنعت کار اپنی صنعت و حرفت میں نیک نیت ثواب کی رکھے اس کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ جیسی ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہی بچے کو دودھ پلائیں اور اس کا دوسروں سے معاوضہ لیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اپنے ہی بچہ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دودھ پلایا اور معاوضہ فرعون کی طرف سے مفت ملا۔ (بحوالہ معارف القرآن)

مقام فضیلت کا حصول

ہمیں مقام فضیلت حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ حدیث نبوی ﷺ کا مفہوم ہے:

1- قوی مومن کمزور مومن سے بہتر ہے۔

2- دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔

اگر مسلم حکمران مسلم ریاست کو جنگی لحاظ سے قوی سے قوی اور معاشی لحاظ سے مضبوط سے مضبوط تر بنانے کا نصب العین (اسلام کی خاطر) اپناتے تو بہت سے سائنسی انکشافات و ایجادات کے موجد ہوتے اور موجودہ دور میں بھی اس کو جاری رکھتے تو یورپ کو یہ کہنے کی جرات نہ ہوتی کہ جدید سائنس اور صنعت کی ترقی میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں تو ہم انہیں کیوں کچھ دیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں نے سائنس و صنعت کے میدان میں کارنامے انجام دیئے تھے۔ مگر جب خلافت ختم ہوئی تو مسلمانوں میں جلد ہی جاگیرداریت پر مبنی شہنشاہیت آ گئی۔ جاگیردارانہ نظام میں صنعتی ارتقاء اور سائنس کے فروغ و تحقیق کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ حکمرانوں کی پسند کی مصنوعات بنائی جاتی ہیں، ان کی جہت کسی بلند نصب العین کی ماتحت نہیں ہوتی۔ سائنس بھی اشرافیہ تک محدود ہوتی ہے۔ سائنس کا مقصد جنگی قوت، معاشی استحکام یا خدمت خلق نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے عوام میں اس کو فروغ نہیں دیا جاتا۔

جاگیرداری نظام میں زرعی معیشت پر ہی زور ہوتا ہے۔ جاگیردار مقتدر طبقہ حکومت پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لئے صنعتی ارتقاء کی حوصلہ شکنی کرتا ہے، تجارت کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے، طرح طرح کے ٹیکس عائد کئے جاتے ہیں، عوام ڈر اور خوف کی وجہ سے دولت چھپاتے ہیں جس سے سرمایہ کاری نہیں ہوتی، اور یوں ترقی رک جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام نے زراعت کی ترغیب بھی دی ہے اور اس کی خوبیاں بھی بیان کی ہیں نیز اس کی خدمت کو باعث ثواب قرار دیا ہے۔ لیکن اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ ملت اسلامیہ کی سرگرمیاں زراعت کے لئے وقف ہو کر رہ جائیں جس طرح سیپی کا کیڑا سیپی کے اندر بند ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسلام نے اپنے پیروکاروں کے لئے صرف کاشت کاری پر اکتفا کرنا اور بیلوں کی دم کے پیچھے پیچھے چلتے رہنا ناپسند کیا ہے کیونکہ اس صورت میں ملت اسلامیہ پیش آمدہ خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ اس لئے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اسے باعث ذلت

قرار دیا اور زمانہ نے اس کی پوری تصدیق کردی۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''جب تم عینہ کی بیع کرنے لگو گے (ایک خاص قسم کی بیع یعنی تجارت جس میں سود کی شکل پیدا ہو جاتی ہے) اور بیلوں کی دم پکڑے رہو گے، زراعت کو پسند کرو گے اور جہاد کو ترک کرو گے تو اللہ تم پر ذلت مسلط فرمائے گا۔ پھر اسے دور نہیں کرے گا جب تک تم اپنے دین کی طرف لوٹ نہ آؤ''۔ (ابوداؤد)

لہٰذا زراعت کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت بھی ضروری ہے۔ ان چیزوں کے ذریعے ایک آزاد اور طاقتور امت نیز ایک مستحکم اور خود کفیل حکومت کے لوازمات پورے ہو سکتے ہیں۔ صنعت و حرفت اسلام کی رو سے ایک جائز خدمت ہی نہیں بلکہ علماء کے مطابق فرض کفایہ بھی ہیں۔ اس مفہوم میں امت مسلمہ کے اندر صنعت و حرفت اور ہر فن کو جاننے والے اتنی وافر تعداد میں ہونے چاہئیں کہ جماعت یعنی امت مسلمہ کی ضرورتیں پوری ہو جائیں اور وہ اپنا کام ٹھیک طریقے سے انجام دے سکے۔

سائنس اور صنعتی ارتقاء

صنعتی ارتقاء کے لئے سائنس کا فروغ، اس میں تحقیق (تاکہ سائنسی اصول دریافت کئے جائیں) ایک اہم تقاضا ہے۔ طیارے جو آج کی جنگوں میں فیصلہ کن چیز بن چکے ہیں سائنسی اصولوں کی دریافت کے بعد ہی ایجاد ہوئے۔

چنانچہ ہوائی جہاز کی ایجاد کی تاریخ بتاتی ہے کہ اٹھارہویں صدی کے آخر میں گرم ہوا سے بھرے، بڑے بڑے غباروں کے ذریعے ہوا میں اڑنے کی ابتداء ہوئی۔ بنیادی اصول یہ تھا کہ گرم ہوا میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ چیزوں کو لے کر اوپر اٹھ سکتی ہے۔ اڑنے کا اصول ارشمیدس کے اصولوں پر مبنی ہے کہ اڑان اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اڑنے والی چیزیں اس ہوا کے وزن سے جو ہوا اٹھاتی ہے، ہلکی ہو۔

مسلم حکمرانوں کو چاہیے کہ صنعتی ارتقاء کے لئے سائنسی تحقیق کا انتظام کریں اور ہر سال ہر اسلامی ملک کم سے کم چار ہزار کے قریب سائنس دان و انجینئر پیدا کرے۔ کیونکہ مفکرین کے مطابق ترقی کے لئے ہر ملک میں کم از کم چار ہزار سائنس دان و انجینئر ہونے چاہئیں۔

(بشکریہ گلوبل سائنس)

زندگی اور موت کا سوال

- جب ہمارا دین مکمل، ہمارا نبی ﷺ برحق اور ہمارا قرآن اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے تو پھر ملت اسلامیہ کے زوال کی وجہ کیا ہے؟
- جب اللہ تعالےٰ نے ہم سے وعدہ فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمہیں غالب رہو گے اور یہ بھی کہ اگر اللہ تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ تو پھر ہم اسقدر مغلوب بے بس اور رسوا کیوں ہیں؟
- مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں اور حج بھی پہلے سے زیادہ کرتے ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر عرس بھی خوب شاندار طریقہ سے مناتے ہیں۔ ماہ محرم میں بھی [illegible]یا جوش وخروش ہوتا ہے۔ مالدار بھی بہت ہیں اور لاکھوں لوگ کوٹھیوں، کاروں اور کار[illegible]نوں کے مالک ہیں تو پھر یہ مردنی کیوں ہے اور یہ تنزل کیوں ہو رہا ہے؟
- ہر [illegible]ور ملک کی نظریں ہمارے ملکوں پر کیوں لگی ہیں اور ہر طرف خون مسلم اسقدر بے [illegible]ردی اور ارزانی کے ساتھ کیوں بہایا جا رہا ہے؟
- نکبت و ادبار کی موجودہ حالت سے نکلنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور کونسے لائحہ عمل پر چل کر ہم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرسکتے ہیں.

بانیٔ سلسلہ کی دیگر تصانیف

قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔

کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔

یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں۔ جس پر عمل کرکے
کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

کتاب ہذا وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلل اور اہم دستاویز ہے
خواجہؒ صاحب نے ذاتی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کیا
ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وحدت شہود میں فرق۔
انسان کی بقا اور ترقی کیلئے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔
وہ بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا۔
روحانی سلوک کے دوران تمام بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔